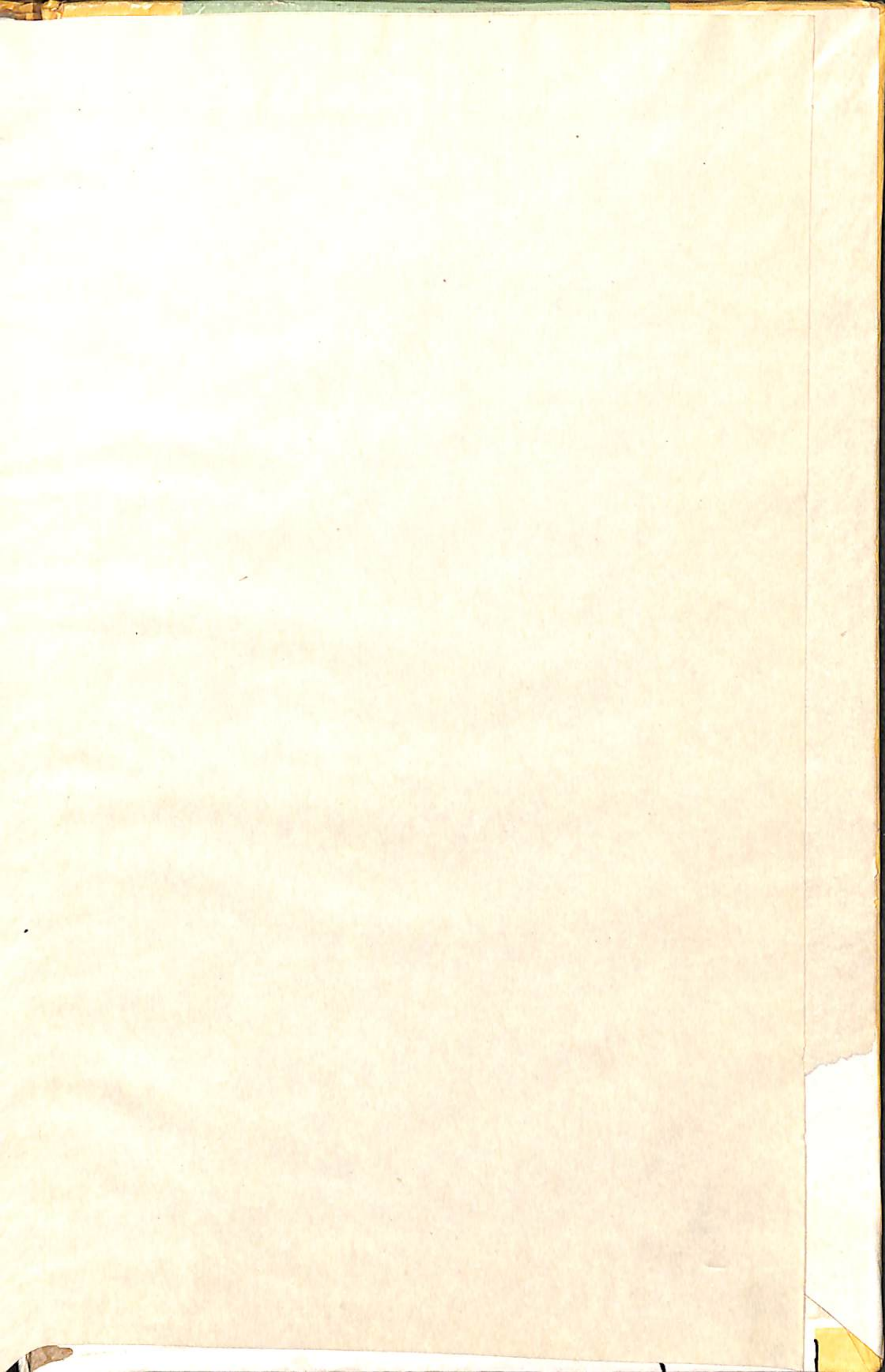
موم کی گڑیا

دلیپ سنگھ





موم کی گڑیا

موم کی گڑیا

ناٹک

دلیپ سنگھ

چھ سو
انیس سو بانوے
پہلی بار

پروڈکشن : مضطرب صحرائی
کاتب : ایم عمران اعظمی

کور ڈیزائن اور کتاب میں شامل اسکیچز : پُلک بسواس
مصنّف کا اسکیچ : شکیل اعجاز

طباعت : اے ون آفسیٹ پرنٹرز
کوچہ چیلان، گلی راجان، دہلی ۱۱۰۰۰۶

ناشر : دلیپ سنگھ
۵۹/۴ راجندر نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۰

تقسیم کار :

شانِ ہند پبلی کیشنز
فلیٹ نمبر ۸، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
رلن پبلی کیشن سروسز
ڈی۔۱۷، بی۔کے۔دت کالونی، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۳

قیمت : پچاس روپے

یہ کتاب
فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومتِ اُترپردیش، لکھنؤ
کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

جناب احمد سعید ملیح آبادی

مدیر روزنامہ "آزاد ہند" کلکتہ

کے نام

بصد خلوص و نیاز

مرزا ہادی رُسوا کے شہرۂ آفاق ناول

"اُمراؤ جان ادا"

پر مبنی ناٹک

"آپ سمجھتے ہیں یہ بہت بڑی بات ہے کہ آپ کا دِل صاف ہو گیا۔ میرے دِل کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے کیا؟ آپ کے دل میں محبّت کی آگ بھڑکے تو اُسے میرے دِل میں بھی بھڑکنا چاہیئے؟ آپ کے دل میں یہ بھڑکا ہُوا شعلہ راکھ ہو جائے تو کیا مجھے بھی یہ شعلہ بجھانا ضروری ہو جاتا ہے؟ مَیں "موم کی گُڑیا" نہیں ہُوں شیدا صاحب کہ آپ جب چاہیں مجھے توڑ مروڑ سکتے ہیں۔ مَیں ایک عورت ہُوں، جس کے سینے میں ایک دھڑکتا ہُوا دِل ہے۔ اِس دِل نے کسی کے اشاروں پر دھڑکنا نہیں سیکھا۔ اِس کی دھڑکن کسی کی مرہُونِ منّت نہیں۔"

(اِسی ناٹک سے)











دیباچہ

وہ لوگ بھی اپنے طور پر ادب کی تھوڑی بہت
خدمت ضرور کرتے ہیں جو اسے وسیع تر حلقوں میں
مقبول بناتے ہیں۔ کلاسیکی ادب کا حال "پکّے
گانے کا سا ہے اس کے لئے ذوق کی تربیت
ضروری ہے اور ہر شخص کو آج کے معاشرے میں
اس کے مواقع میسّر نہیں ہوتے کہ چلتے ہوئے
گاتے اور چٹ پٹے ادب سے دامن بچا کر "سچّے
اور اچھّے" ادب کا ذوق پیدا کرے۔ اس لئے جو
ادب کے شاہکاروں کو عوام تک پہنچاتے ہیں
ان کا کام بھی کچھ کم اہم نہیں۔
اُمراؤ جان اداؔ نے ناول کی حیثیت سے

تو جگ جیتا مگر سٹیج پر اسے دلیپ سنگھ کے ڈرامے نے متعارف کرایا۔ ظاہر ہے ناول کی صنف سے جب اسے ڈرامے کی صنف میں ڈھالا گیا تو اس میں بہت کچھ ردّوبدل بھی ہُوا۔ ناول میں عبارت آرائی کا بھی مزا ہوتا ہے مگر ڈراما صرف مکالمے اور واقعات کے سہارے چلتا ہے۔ واقعہ محض عبارت آرائی نہیں چاہتا بلکہ ایسی کڑیاں چاہتا ہے جنھیں دیکھنے والوں کا ذہن قبول کر سکے۔ دلیپ سنگھ نے ایسی کڑیاں فراہم کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں اپنی طرف سے ناول کے سانچے میں تھوڑی پھیر بدل بھی کر لی ہے۔

معاملہ یُوں ہے کہ ناول پڑھتے وقت بھی یہ خیال آپ کو ستاتا ہے کہ آخر اُمراؤ جان اور اس کے سچّے قدرداں نواب صاحب کے درمیان دُوری قائم رہنے کا کیا راز ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے قریب ہیں لیکن پھر بھی ایک دریا کے دو کناروں کی طرح کبھی ایک دوسرے سے مل نہیں پاتے اور جب بچھڑ جانے کے بہت دنوں بعد اتفاقاً ملتے بھی ہیں تو اُمراؤ جان کی پُرانی سہیلی سے نواب صاحب کی شادی ہو چکی ہے اور دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے کے باوجود ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کی زندگی سے دُور جا چکے ہیں۔

اس الجھن کا حل دلیپ سنگھ نے انور کے

کردار کے ذریعے سے نکالا ہے، جو بی خانم کے اشارے سے فیض آباد سے آنے والا نو وارد بن کر آتا ہے۔ امراؤ کے خاندان کے بارے میں المناک خبریں سُناتا ہے۔ مجرا سُننے کی فرمائش کرتا ہے، جبکہ نواب صاحب نے کسی اور کے سامنے مجُرا نہ کرنے کی پابندی عائد کر رکھی تھی۔ نواب سلطان عین اس مجُرے کے موقع پر کسی بہانے سے بلائے جاتے ہیں اور یہی مجُرا دونوں کے درمیان غلط فہمی کی بنیاد بن جاتا ہے اور جب یہ غلط فہمی دُور ہوتی ہے تو حالات مختلف ہو چکے ہوتے ہیں اور نواب سلطان کسی اور سے شادی کر چکے ہوتے ہیں۔

دلیپ سنگھ نے ڈرامے کی تہذیبی فضا کو قائم رکھنے کے لئے اور بھی کئی حربے کامیابی کے ساتھ استعمال کئے ہیں۔ یوُں بھی طوائف کا کوٹھا موسیقی، مجُرا اور جاگیرداری کی تہذیب کا مرکز تو ہوتا ہی تھا، یہاں تک کہا جاتا ہے کہ شرفا اپنے بچّوں کو تہذیب سیکھنے انھیں محفلوں میں بھیجا کرتے تھے۔ اس کی چمک دمک آج کے دَور کے ویران معاشرے کے لئے بھی کوشش کا باعث تو ہے ہی اسی میں اضافہ کیا ہے مشاعرے نے جو خود ایک مقبول ادارہ ہے اور شعر و شاعری، رقص و موسیقی کے اس پورے ساز و سامان کے ساتھ دلیپ سنگھ نے مرزا محمد ہادی رسوا کے ناول "اُمراؤ جان ادا" کو ڈرامے

کے رُوپ میں پیش کیا ہے۔ مکالموں میں دل کشی اور آراستگی کا خیال رکھا ہے اور لکھنؤ کی تہذیب کا رچاؤ ان میں نمایاں ہے۔ اس لحاظ سے یہ کوئی تعجّب کی بات نہیں کہ دلیپ سنگھ کا ڈراما اسٹیج پر بھی مقبول ہُوا اور کئی بار حاضرین سے داد وصول کرنے میں کامیاب رہا۔

"اُمراؤ جان ادا" کو دیکھنے اور اس کا مطالعہ کرنے کے کئی پہلو ہیں۔ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ خیر و شر، نیکی اور بدی کے جو معیار ہم نے اور ہمارے سماج نے اپنے فیصلوں اور نظریوں کے مُطابق برس ہا برس سے طے کر رکھے ہیں، کیا وہ واقعی منصفانہ ہیں۔ آخر بیچاری امیرن کا اس میں کیا قصور ہے کہ وہ اپنے باپ کے سچ بولنے کے جرم میں ایک پیشہ ور مجرم دلاور خاں کے ہاتھوں اغوا ہو جاتی ہے اور ایسے لوگوں میں پرورش پاتی ہے، جن میں عصمت فروشی عیب نہیں بلکہ طرزِ زندگی ہے۔ ناچ گانا ہُنر سمجھا جاتا ہے۔ غرض ایسی قدروں سے دوچار ہوتی ہے اور انھیں سیکھنے اور اختیار کرنے پر مجبور ہوتی ہے جو شرفا کے معاشرے سے مختلف ہیں۔ پھر اس دَلدَل سے جب بھی نکلنے کی کوشش کرتی ہے یا نکلنے کے موقعے آتے ہیں تو ہر بار تقدیر آڑے آجاتی ہے اور اس کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں۔

دلیپ سنگھ نے تو خیرانور کا کردار ایجاد کر کے
ناول میں ویلن کی کمی کو پورا کیا ہے۔ لیکن غور سے کیجئے
تو "امراؤ جان ادا" ناول میں کوئی ویلن نہیں ہے۔ دلاور
خان نے اتنا جرم ضرور کیا کہ امیرن کو اغوا کر کے
بی خانم کے ہاتھوں فروخت کر دیا اور اسے بازارِ حسن
کی زینت بنا دیا، لیکن بس اتنا کام کرنے کے بعد وہ
ناول سے غائب ہی ہو گیا۔ بعد کو آیا بھی تو اپنی سزا
بھگتنے کے لئے۔ اس کے علاوہ امیرن کو امراؤ جان بنانے
کا سارا کام تو بسم اللہ اور خانم نے کیا یا پھر تقدیر نے۔
اور ہر بار اس جال سے نکلنے کی تدبیروں کو ناکام بنایا
اس اَن دیکھے ہاتھ نے جسے سماجی نظام بھی کہا جا سکتا
ہے اور تقدیر بھی۔

دلیپ سنگھ نے اس دل دوز داستان
کو ڈرامائی جواز کے ساتھ اسٹیج پر پیش کرنے کی
کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے ناول کو ڈرامے کا روپ
دینا مشکل کام ہے اور دلیپ سنگھ دلیپ سنگھ
ہی ہیں، مرزا محمد ہادی رسوا نہیں ہیں۔ اس لئے اس
ڈرامے کو پڑھتے وقت ان کی اپنی حد بندیوں کا
خیال رکھنا ضروری ہے اور ہر منظر کو تصور کے
پردے پر دیکھنا بھی لازم ہے۔ اس صورت میں
اس کا لطف دوبالا ہو جائے گا اور "امراؤ جان ادا"

کا مزا ان لوگوں کو بھی آئے گا جو اسے ناول کی شکل
میں پڑھنے سے محروم رہے ہیں۔ اس اعتبار سے
دلیپ سنگھ مزور داد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ناول
کو المار ی کے سب سے اُونچے خانے سے نکال کر
اسٹیج کے شائقین اور ناظرین سے روشناس کرایا اور
اسے مقبولیت کے نئے اور وسیع تر حلقے تک
پہنچا دیا۔

دہلی۔ ۷/ مارچ ۱۹۸۸ء

محمد حسن

گذارشِ احوالِ واقعی

"اُمراؤجان اداؔ" اُردو کا ایک عظیم ناول ہے جسے قریب ۱۹۰۲ء میں مرزا ہادی رُسواؔ نے تحریر کیا۔ بظاہر تو یہ لکھنؤ کی ایک طوائف کی داستان ہے جو ایک مشہور شاعرہ بھی تھی اور باکمال گلوکارہ بھی۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو اس ناول کا مرکزی کردار کوئی ایک شخص نہیں بلکہ اُن دِنوں کا لکھنؤ ہے۔ چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ ناول لکھنؤ کی زندگی پر ہے۔ مرزا رسوؔا کا کمال یہ ہے کہ اس ناول میں پُورا ایک شہر سانس لیتا نظر آتا ہے۔ اس شہر کے لوگ، اس شہر کا کلچر، اس شہر کی تہذیب۔

مَیں نے جب اس ناول کو ناٹک میں ڈھالنے کا ارادہ کیا تو مُجھے احساس ہوا کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یُوں تو ناول میں ایسے بے شمار واقعات ہیں جن میں ناٹک کے عنصر پائے جاتے ہیں لیکن پُورا ناول ایسی کہانی نہیں ہے جو آسانی سے ناٹک میں بدل جائے۔ چنانچہ مجھے کچھ نئے کرداروں کی تشکیل کرنا پڑی اور ناول میں موجود کچھ واقعات میں ردّوبدل کرنا پڑا۔

سب سے زیادہ مُشکل مجھے یہ طے کرنے میں ہوئی کہ ناٹک کی اُمراؤجان کا کردار کیا ہو۔ اُمراؤجان کا طریقۂ زندگی وہ نہیں تھا جو عام طور پر طوائفوں کا ہوتا ہے۔ مرزا رُسواؔ نے اس کا اشارہ اپنے ناول کے پہلے باب میں ہی کیا ہے:

"اُسی کمرے کے برابر ایک اور کمرہ تھا۔ اُس میں ایک طوائف رہتی تھی۔ بُود و باش کا طریقہ اور رنڈیوں سے بالکل علیحدہ تھا۔

نہ کبھی کسی نے کمرے پر سرِ راہ بیٹھے دیکھا نہ وہاں کسی کی آمد و رفت تھی۔ دروازوں پر دن رات پردے پڑے رہتے تھے۔۔۔۔
اگر کبھی رات کو گانے کی آواز نہ آیا کرتی تو یہ بھی نہ معلوم ہوتا کہ اس کمرے میں کوئی رہتا بھی ہے یا نہیں۔"

ناول میں ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ ایک اُونچے تخیّل کی شاعرہ اور ایک باکمال گلوکارہ تھی۔ دوسرے لفظوں میں ایک رنڈی کی زندگی بسر کرتے ہوئے بھی وہ ایک مکمّل عورت تھی۔ مَیں نے انہی عناصر کو ذہن میں رکھ کر اُس کے کردار کی تشکیل کی ہے۔

مجھے احساس تھا کہ مرزا رسوؔا کے ناول کا ہیرو شہر لکھنؤ ہے۔ ناٹک لکھتے وقت مَیں نے یہ بات ذہن میں رکھی کہ میرے کردار اُسی زبان میں گفتگو کریں، جو اُن دنوں کے لکھنؤ میں بولی جاتی تھی۔ بلکہ مَیں نے تو جہاں تک ممکن تھا مرزا رسوؔا کے جملے ہی اپنے کرداروں سے بلوائے ہیں اور مرزا رسوؔا کے اشعار کو ہی اپنے ناٹک کی زینت بنایا ہے۔

مَیں جناب ڈاکٹر حسن صاحب کا شکر گذار ہوں کہ اُنھوں نے میری درخواست پر اس ناٹک کا دیباچہ لکھا۔ اپنے محترم دوست جناب سروؔر تونسوی کا بھی شکریہ مجھ پر لازم ہے کہ اُنھوں نے اس کتاب کی اشاعت میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو داؤ پر لگا دیا۔

یکم مئی ۱۹۹۲ء

دلیپ سنگھ

۵۹/۴ راجندر نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۶۰

کردار

امراؤ جان ادا : لکھنؤ کی ایک طوائف جو ایک مشہور شاعرہ اور گلوکارہ ہے

بی خانم : ایک ڈیرے دار طوائف، ادا اسی کے کوٹھے کی زینت ہے

مرزا رسوا : ایک جہاں دیدہ آدمی جو ادا کا دوست ہے

سلطان شیدا : ایک امیر زادہ جو ادا کا عاشقِ زار ہے

بیگم صاحبہ : سلطان شیدا کی ماں

بڑھیا : ادا کی ماں

بھائی : ادا کا بھائی

منشی جی
شیخ
پنڈت جی
چاند
اثر

} سلطانِ شیدا اور مرزا رسوا کے شاعر دوست

انور : ایک اوباش آدمی جو دولت کی خاطر کچھ بھی کر گزرنے کو تیار رہے

رقّاصہ 'ایک'
رقّاصہ 'دو'] بی خانم کے کوٹھے کی ۲ طوائفیں

اور سازندے

پہلا ایکٹ

پہلا منظر — ایک طوائف کا کوٹھا

[ایک طوائف کا کوٹھا۔ ایک طرف بی خانم بیٹھی پان لگا لگا کر طشتری میں رکھ رہی ہیں۔ اُن کے پاس دو لڑکیاں رقص کے لباس میں بیٹھی ہیں۔ سازندے سازوں پر ایک دُھن بجا رہے ہیں، جس پر دو لڑکیاں ہاتھ پاؤں سے ہلکے ہلکے تال دے رہی ہیں۔ چھ سات تماشائی بیٹھے ہیں۔ ایک لمحے کے بعد امراؤ جان سٹیج پر آتی ہے۔ اُس کے داخل ہوتے ہی سُبحان اللہ کا نعرہ بلند ہوتا ہے۔ ادا ایک اچٹتی ہوئی نظر سے تماشائیوں کو

دیکھتی ہے۔ اور پھر اُس کی نگاہ ایک لمحے کے
لئے سلطان شیدا پر رُک جاتی ہے۔ پھر وہ
مرزا رُسوا کو دیکھتی ہے۔ اور دیکھتے ہی کہتی
ہے]

ادا: اخاہ! تو رُسوا صاحب بھی تشریف رکھتے ہیں۔ کیوں
حضور اتنے دن کہاں رہے؟

رسوا: آپ تو جانتی ہیں کہیں ٹک کر بیٹھنا میری فطرت کے
خلاف ہے۔ آوارہ گردی میرے مزاج کا حصہ بن چکی
ہے۔ بس نکل گیا تھا اپنی خصلت کی بھوک مٹانے۔

ادا: ابتدا آوارگی کی جوشِ وحشت کا سبب
ہم تو سمجھے ہیں مگر ناصح کو سمجھائیں گے کیا

(تماشائیوں کی طرف سے داد)

رسوا: دیکھئے آئے تو ہم ہیں ایک عرصے کے بعد
لیکن اپنے ساتھ ایک خاص دوست کو لاکے ہم نے
یہ کمی ایک حد تک پوُری کردی ہے۔ یہ ہیں سُلطان
شیدا صاحب۔

ادا: زہے نصیب آپ ہمارے ہاں تشریف لائے۔ آپ
بھی لکھنؤ کے ہیں نا؟

رُسوا: ہیں تو لکھنؤ کے لیکن عرصے سے باہر مقیم تھے۔ چند دن ہوئے

لکھنؤ لوٹے ہیں۔ اور اب ہم اُمید کر رہے ہیں کہ یہیں بس جائیں گے۔ کہئے ہمارے مہمان کو کیا سُنا رہی ہیں؟

اداؔ: لُطف ہے کونسی کہانی میں
آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی

[تماشائیوں کی طرف سے داد]

رُسواؔ: اِس کا فیصلہ ہم آپ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ صرف اتنی گذارش کروں گا کہ شیداؔ صاحب شاعر ہیں۔ اس بات کو ذہن میں رکھ کر غزل سُنائیے گا۔

[اداؔ سازندوں کو اشارہ کرتی ہے اور غزل شروع کرتی ہے۔ اُس کے ساتھ اُس کی دو ساتھی لڑکیاں رقص کرتی ہیں۔ گاتے ہوئے اداؔ کی توجّہ سُلطان شیداؔ پر مرکوز ہے اور لگتا ہے کہ اُسے دیکھ کر اداؔ کے دل میں ایک محبّت کی کرن پھوٹی ہے]

غزل

آج اِس بزم میں وہ جلوہ نُما ہوتا ہے
دیکھئے دیکھئے اِک آن میں کیا ہوتا ہے

پھر نظر چھپتی ہے، آنکھ جھکی جاتی ہے
دیکھئے دیکھئے پھر تیر خطا ہوتا ہے

عشق میں حسرتِ دل کا تو نکلنا کیسا
دَم نکلنے میں بھی کمبخت مزا ہوتا ہے

حالِ دل اُن سے نہ کہنا تھا ہمیں چوک گئے
اب کوئی بات بنائیں بھی تو کیا ہوتا ہے

شوقِ اظہار اگر ہے تو مرے دل کو نہ توڑ
اِسی آئینے میں تُو جلوہ نُما ہوتا ہے

شیدا: والله آپ خوب گاتی ہیں۔ لیکن آپ کے گلے سے زیادہ مَیں آپ کے انتخاب کی داد دُوں گا۔ کیا حسین غزل ہے۔ امراؤ جان ادؔا کی ہے نا؟

ادا: جی!

شیدا: مَیں اُن کی شاعری کا دیوانہ ہوں۔ میری ناچیز رائے میں وہ اپنے کلام میں ستارے سے جڑ دیتی ہیں، جو دل و دماغ کو روشن کر دیتے ہیں۔

ادا: مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کو ادؔا کا کلام پسند ہے۔ پان قبول فرمائیے۔

سلطان طشتری سے پان اُٹھا کر رُسوا کی طرف
بڑھا دیتا ہے۔

ادا: آپ لیجئے، انھیں بھی پیش کرتی ہوں۔
شیدا: معاف کیجئے میں نہ لے سکوں گا۔
ادا: کیوں؟ اس میں زہر نہیں ہے شیدا صاحب۔
شیدا: جانتا ہوں۔ لیکن خاندانی شرافت کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ ان انگلیوں سے چھُوا ہوا پان میرے حلق سے کیسے نیچے اُترے گا، جو کسی کے اشاروں پر کھُلتی یا بند ہوتی ہیں۔ (امراؤ جان ایک دَم سکتے میں آجاتی ہے) ویسے (تھالی میں کچھ اشرفیاں رکھتا ہوا) یہاں تک آگیا ہوں تو نذرانہ دیئے بغیر نہیں جاؤں گا۔
ادا: یہ اشرفیاں! (پھینکتی ہوئی) یہ اشرفیاں لے جائیے اور ہماری طرف سے غریبوں میں بانٹ دیجئے گا۔ اللہ شاید آپ کا گناہ معاف کر دے کہ آپ نے ایک طوائف کے کوٹھے پر قدم رکھا۔

(غصّے سے چلی جاتی ہے)

شیدا: ایک طوائف اور یہ تیور۔ اُٹھیے رُسوا صاحب۔ آپ نے تو ہمیں امراؤ جان ادا سے ملوانے کا وعدہ کیا تھا۔ آپ ہمیں یہاں کہاں لے آئے۔

رُسوا: ابھی ابھی آپ جن سے ملے، وہ اُمراؤ جان ادا ہی تو تھیں۔

شیدا: اُمراؤ جان ادا . . . . ادا ایک طوائف ہے۔ اُمراؤ جان ادا ایک طوائف ہے۔ رُسوا صاحب یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔

رُسوا: مَیں حقیقت عرض کر رہا ہوں شیدا صاحب۔

شیدا: اتنے اُونچے تخیّل کی مالک۔ اتنے خوب صورت لہجے کی شاعرہ ایک طوائف ہے۔ یہ نا ممکن ہے

رُسوا: کیچڑ میں کمل اُگتے نہیں دیکھا کبھی آپ نے؟

شیدا: انھیں بلوائیے رُسوا صاحب۔ ہم اُن سے اپنی گستاخی کی معافی مانگیں گے۔

رُسوا: اُس کا یہ موقع نہیں ہے۔ پھر کبھی دیکھیں گے۔ چلیے گھر چلیں۔

[سُلطان شیدا ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح اُٹھتا ہے]

شیدا: اُمراؤ جان ادا ایک طوائف ہے۔ میرے اللہ یہ کیا . . . ایک طوائف ایک شاعرہ۔

(پردہ)

دوسرا منظر۔ سلطان شیدا کا گھر

(رات کے آٹھ بجے کا وقت۔ مرزا رسوا،
سلطان شیدا، میر صاحب، منشی جی، خان
صاحب، شیخ صاحب اور کچھ اور لوگ
تشریف رکھتے ہیں)

شیدا: رسوا صاحب۔ آپ کی امراؤ جان تو تشریف نہیں لائیں۔ بہت انتظار ہو چکا۔ اجازت ہو تو مشاعرے کا آغاز کیا جائے۔

رسوا: انھیں اب تک آجانا چاہیئے تھا۔

شیدا: جی ہاں۔ مگر ہو سکتا ہے، ان کے پاؤں کی مہندی نہ سوکھی ہو۔ اس لئے چلنے پھرنے سے معذور ہوں یا پھر۔۔۔

رسوا: یا پھر کیا؟

شیدا: یا پھر ان کے چاہنے والوں نے ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی ہوں اشرفیوں کی اور ۔ ۔ ۔

رسوا: شیدا صاحب ۔ آپ ابھی تک امراؤ جان ادا کو پہچان نہیں پائے ۔ انھیں شاعری سے عشق ہے اور وہ یہاں ضرور آئیں گی ۔

شیدا: شاید آپ یہ بھول رہے ہیں کہ وہ ایک طوائف بھی ہے ۔ اور طوائف صرف دولت سے محبّت کرتی ہے ۔ اُسے اور کسی چیز سے سروکار نہیں ہوتا ۔ وہ یہاں نہیں آئیں گی حضور ۔

رسوا: لیکن شیدا صاحب ۔ ۔ ۔ ۔

شیدا: آپ مشاعرے کا آغاز کیجئے ۔ اور ایک طوائف پر اتنا ہی اعتبار رکھئے جس کی وہ اہل ہے ۔

ہاں صاحب ارشاد ہو ۔

رسوا: مَیں عرض کروں؟

شیدا: جی ہاں ۔ مشاعرے کا آغاز آپ کے اشعار سے ہو، اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے ۔

ارشاد!

دوسرے لوگ: جی ہاں ارشاد ہو ۔

رُسوا: عرض کرتا ہوں کہ:

کعبے میں جا کے بھول گیا راہ دَیر کی

[واہ کا ایک نعرہ بلند ہوتا ہے]

رُسوا: کعبے میں جاکے بھُول گیا راہ دیر کی
(شرمندہ سا ہو کر) آپ نے اچانک شروع کروا دیا نا۔
اب دُوسرا مصرع ہی ذہن میں نہیں رہا۔

منشی: گویا دیَر کی راہ بھی بھول گئے اور دوسرا مصرع بھی۔

(قہقہہ)

شیدا: رُسوا صاحب ذہن پر زور دیجئے۔ یاد آجائے گا۔

رُسوا: (پھر سے پڑھتا ہے) کعبے میں جاکے بھول گیا راہ دَیر کی۔
(اس پر اُمراؤ اندر آتی ہے اور دوسرا مصرع پڑھ دیتی ہے۔)

ادا: ایمان بچ گیا، میرے مَولا نے خیر کی

(واہ کا ایک نعرہ گونجتا ہے)

ادا: تسلیم عرض کرتی ہوں۔ معاف کیجئے، آنے میں کچھُ دیر ہو گئی۔

رُسوا: ایسی کوئی دیر بھی نہیں ہوئی۔ ہم لوگ بس شروع ہی ہوئے تھے۔

مُنشی: بلکہ سچ پوچھئے تو شروعات پر اٹکے ہوئے تھے۔

(قہقہہ)

ادا: اب آپ اٹکیں گے نہیں۔ شروع کیجئے۔

رسوا: شیدا صاحب مجھے معاف فرمائیں۔ مجھے اپنی غزل یاد نہیں آرہی۔ تب تک کوئی اور صاحب کرم فرمائیں۔

شیخ: لیجئے ہم پڑھے دیتے ہیں۔

سارے: ارشاد!

شیخ: ؎ عرض وہ عرض کہ جس عرض میں اصرار نہ ہو
بات وہ بات کہ جس بات سے انکار نہ ہو

(ہر شعر پر تعریف اور شیخ صاحب تسلیم کہتے ہیں)

شیخ: ؎ مثلِ یوسف سرِ بازار پڑے پھرتے ہو
کیا ہی شرماؤ، اگر کوئی خریدار نہ ہو

دل وہ اچھا جو حسینوں کی نظر میں نہ جچے
جنس وہ خوب کوئی جس کا خریدار نہ ہو

قتلِ عشاق کی بے کار قسم کھاتے ہو
ہم نہ مانیں گے اگر ہاتھ میں تلوار نہ ہو

(واہ، واہ کا شور بلند ہوتا ہے)

رسوا: پنڈت جی اب آپ کچھ فرمائیے۔

پنڈت: اس وقت کچھ یاد نہیں آرہا۔

منشی: پنڈت جی کا دھیان تو پان دان میں ہے۔ شعر کیا خاک یاد آئے گا۔

(قہقہہ)

پنڈت: لیجیے حضور چند شعر ملاحظہ فرمائیے:

وصل میں ذکرِ عدو بھی دَم بدم ہوتا رہا
شربتِ دیدار میرے حق میں سم ہوتا رہا

زاہدو! دو دن سے چرچا حق پرستی کا ہوا
ورنہ کعبہ میں سدا ذکرِ صنم ہوتا رہا

زُلف کی تعریف میں دفتر کے دفتر لکھ دیئے
مُو بمُو حالِ پریشانی رقم ہوتا رہا

واعظا کیوں سر جُھکائے وہ کسی کے روبرو
جس کا سر نقشِ قدم پر اُس کے خم ہوتا رہا

(حاضرین کی داد)

شیدا: ہاں منشی جی اب آپ کچھ فرمائیے۔

(منشی جی شعر پڑھتے ہیں۔ اور حاضرین
قہقہے پر قہقہے لگا رہے ہیں۔ خاص طور پر
اُمراؤ جان کا بُرا حال ہے۔)

منشی: ؎ کہیں سامان ایسے ہوں تو کچھ دل کو مرے کل ہو
مٹر اُبلے ہوئے ہوں اور اِک ٹھرّے کی بوتل ہو

اگر جاڑے میں تو رل جائے تو کیا غم ہے جاڑے کا
تیری زلفیں ہوں شانے پر دوشالہ ہو نہ کمبل ہو

کہو عشّاق سے اپنے کہ ضبط گریہ فرمائیں
رُکے گا راستہ گھر کا اگر کوچے میں دلدل ہو

کسی صورت سے بہلا لیں گے اُس معشوق کم سن کو
نقد پیسے نہ ہوں تو ریوڑی ہو گول گپّل ہو

مَیں دل کو چیر ڈالوں گا، جو تُم پہلو سے اُٹھ جاؤ
مَیں آنکھیں پھوڑ ڈالوں گا جو تم آنکھوں سے اوجھل ہو

ادا: سچ کہہ رہے ہیں آپ؟
منشی: آپ آنکھوں سے اوجھل ہو کر دیکھئے، دل آپ کے قدموں میں ڈال کر نہ رکھ دُوں تو نام بدل ڈالئے گا۔ ہاں تو عرض کیا

ہے۔ اداؔ صاحبہ یہ شعر بھی آپ کی نظر ہے:

تمھاری سادگی میں کچھ عجب عالم نکلتا ہے
نہ چوٹی ہو نہ کنگھی ہو، نہ مسّی ہو نہ کاجل ہو

اداؔ: اوئی! تو کیا دن رات سر جھاڑ منہ پہاڑ بیٹھے رہیں۔

منشی: ہم تو اپنے معشوق کو اسی حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور پھر اس کا بھی تو خیال کیجئے کہ آپ کا خرچ بچے گا۔

(قہقہہ)

منشی: صاحب آخری شعر عرض کرتا ہوں۔ کہ:

ٹکا وہ ہم سے جب مانگیں انھیں چپکے سے ہم دے دیں
نہ ٹک ٹک ہو نہ جھک جھک ہو نہ کچ کچ ہو نہ کل کل ہو

رُسواؔ: واہ! کیا دریا دلی ہے۔

(قہقہہ)

شیداؔ: منشی جی آپ نے مقطع نہیں سُنایا۔

منشی: عرض یہ ہے حضور کہ مقطع میں اُس شاعر کا نام آتا ہے، جس کی

غزل چوری کرکے آپ کی خدمت میں عرض کی ہے۔ مقطع پڑھوں گا تو پکڑا جاؤں گا۔

(قہقہہ)

شیدا: رسوا صاحب۔ اب تک تو آپ کو اپنی غزل یاد آ گئی ہو گی۔ ہمیں کب تک محروم رکھئے گا۔

رُسوا: وہ غزل تو یاد نہیں آئی۔ البتہ ایک اور غزل عرض کرتا ہوں:

نہ پوچھو ہم سے کیونکر زندگی کے دن گزرتے ہیں
کسی بے درد کی فرقت میں جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

کوئی اُن سے کہے دل لے کے بھی یونہی مُکر جانا
عدو کے سامنے جو گالیاں دے کر مُکرتے ہیں

انھیں کا نام لے لے کر کوئی فرقت میں مرتا ہے
کبھی تو وہ بھی سُن لیں گے جو بدنامی سے ڈرتے ہیں

بگاڑا ہم کو قسمت نے تو پھر بننا نہیں ممکن
وہ گیسو ہیں کسی کے جو بگڑتے ہیں سنورتے ہیں

کبھی شانے سے اُلجھے وہ کبھی آئینے کو توڑا
سنورتے ہیں بگڑتے ہیں، بگڑتے ہیں سنورتے ہیں

ادا سے ناز کو رُسوا ہے دعوئے پارسائی کا
کوئی پوچھے تو آخر مرنے والے کس پہ مرتے ہیں

(سامعین کی داد کا شور)

لیجئے ہم نے تو اپنا فرض پُورا کر دیا۔ اب تو سلطان شیدا صاحب کو غزل سرا ہونے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔

شیدا: رسوا صاحب۔ آپ اور اُمراؤ جان ادا کے سامنے مَیں کیا اور میری شاعری کیا۔ لیکن آپ کا اصرار ہے تو چند شعر حاضر کئے دیتا ہُوں۔

(شیدا شعر پڑھتا ہے اور ادا کی طرف اِس طرح دیکھتا ہے جیسے اُس کی دُنیا سمٹ کر اُس نقطے پر آ گئی ہو۔)

کل رات کو اُنھیں جو کہیں دیر ہو گئی
دُنیا ہماری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی

مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی

آج ان سے ہم نے آنے کا وعدہ لیا تو ہے
دم ہی نکل گیا جو کہیں دیر ہو گئی

میری تباہیوں کی تجھے اب خبر ہوئی
کیا پوچھتے ہو عمر یونہی تیر ہو گئی

سُلطان کس ادا پہ تمھیں پیار آگیا
قدموں پہ اُن کے زندگی جو ڈھیر ہو گئی

(داد کا شور۔ آخری شعر پر سب کا دھیان ادؔا
کی طرف ہے۔ اور لگتا ہے کہ وہ شعر کے معنی
سمجھ رہی ہے)

رُسوؔا: لیجئے حضرات اب اُمراؤ جان ادؔا صاحبہ کی باری ہے۔ یہ مشاعرہ تو صرف اُن کی غزل سُننے کے لئے منعقد کیا گیا تھا۔ ورنہ ہم کیا اور ہماری شاعری کیا۔

منشی: آپ اپنے بارے میں جو چاہیں کہیں لیکن خدارا میری غزل کو معمولی نہ کہئے۔

رسوؔا: کیوں منشی جی۔ آپ بُرا مان گئے۔

منشی: مَیں نہیں وہ بُرا مان جائے گا، جس کی غزل مَیں چُرا کے لایا ہُوں۔

(قہقہہ)

ادؔا: چند شعر عرض کرتی ہوں۔ دیکھئے کسی قابل ہوں تو۔ ۔ ۔

سارے: ارشاد ارشاد۔

ادا: شبِ فرقت بسر نہیں ہوتی
میرے غم کی سحر نہیں ہوتی

جان دینا کسی پہ لازم تھا
زندگی یوں بسر نہیں ہوتی

ہے یقیں وہ نہ آئیں گے پھر بھی
کب نگہ سوئے در نہیں ہوتی

شورِ فریاد تا فلک پہنچا
مگر اُس کو خبر نہیں ہوتی

غلط انداز ہی سہی وہ نظر
کیوں مرے حال پر نہیں ہوتی

اے ادا ہم کبھی نہ مانیں گے
دل کو دل کی خبر نہیں ہوتی

(غزل پر اُمراؤ کو بہت داد ملتی ہے)

مُنشی: (اُٹھ کر) اچھا شیدا صاحب اب اجازت دیجئے۔
شیدا: ایسی جلدی بھی کیا؟

منشی: ایسا ہے حضور کہ جیسے ہم لوگ شاعری میں ایک اُمید باندھے رکھتے ہیں، کہ کسی دن ہمارا خیالی محبوب ہمارے سامنے حقیقی لباس میں آکھڑا ہوگا۔ ایسے ہی میرے گھر کی مالکن یعنی مجھ بدنصیب کی بیوی دروازے میں آنکھیں بچھائے کھڑی رہتی ہے، کہ کب ہم گھر لوٹیں۔

رُسوا: اچھا اتنی محبت ہے!

منشی: جی ہاں جب تک ہم گھر نہیں لوٹیں گے، وہ بےچاری لڑے گی کس سے؟

پنڈت: تو گویا آپ گھر نہیں جا رہے۔ اکھاڑے جا رہے ہیں۔

(قہقہہ)

منشی: جی ہاں۔ اور ہم تو عرض کریں گے کہ آپ بھی اپنے اپنے اکھاڑوں کو تشریف لے جائیے۔ رات بہت ہو چکی۔

(قہقہہ)

(سب اُٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ اُمراؤجان اداؔ بھی اُٹھتی ہے اور کہتی ہے)

اداؔ: میرے لئے ڈولی کا انتظام کر دیجئے۔

شیداؔ: ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ ابھی بیٹھئے نا۔

اداؔ: مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن ایک طوائف کے زیادہ دیر بیٹھے

سے آپ کے گھر کی فضا مکدّر نہیں ہو جائے گی کیا؟۔ آپ کی پاکیزگی کو داغ نہیں لگ جائے گا؟ آپ پر لوگ انگلیاں نہیں اُٹھائیں گے، کہ ایک طوائف کو اپنے برابر بٹھا رکھا ہے؟

شیدا: میں جانتا ہوں آپ میرے کل کے سلوک سے نالاں ہیں۔ لیکن آپ خود خیال فرمایئے، کہ مجھ جیسا شخص جس نے ایسے ماحول میں پرورش پائی ہے جہاں بیوی خاوند کے سامنے عشوہ طرازی نہیں کرتی۔ جہاں پرائے مرد سے اچانک چھو جانے پر عورتوں نے خودکشی کر لی، ایک طوائف کا وجود میرے لئے باعثِ نفرت نہیں ہوگا، تو اور کیا ہوگا؟

ادا: آپ کس سے محبّت کرتے ہیں، اور کس سے نفرت اس پر آپ کو پُورا پُورا اختیار ہے۔ میں اس میں دخل دینے والی کون؟

شیدا: اور آپ بھی طنز کے تیروں سے جتنا چاہیں میرے دل کو زخمی کریں اِس پر آپ کو پُورا پُورا اختیار ہے۔ آپ کچھ بھی کہیں، لیکن زندگی بھر یہ سوال میرے دل پر دستک دیتا رہے گا، کہ ایک شاعر کا حسّاس دل رکھنے والی اداؔ جو صرف اپنی شاعری کی بنا پر دلوں پر حکومت کرنے کا حق رکھتی ہے ——— ایک کوٹھے پر کیسے پہنچ گئی۔ اُمراؤ جان کیسے بن گئی۔

اداؔ: آپ میری زندگی کے حالات جاننا چاہتے ہیں؟

شیدا: اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو۔

اداؔ: ؎ کس کو سُنائیں حالِ دلِ زار اے اداؔ
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

شیدا: سُبحان اللہ! لیکن ایک خوبصورت شعر سے دل کی تشنگی نہیں مٹی۔ وہ سوال اب بھی میرے دل میں بے تابیاں پیدا کر رہا ہے۔

ادا: آپ جاننا چاہتے ہیں کہ میں کوٹھے تک کیسے پہنچ گئی؟ میں سمجھتی ہوں اس میں کچھ خاص سمجھنے والی بات نہیں۔ میں آج جس حالت میں ہوں، آپ جیسے مہربانوں کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔ آپ کا بس چلے، تو ایک میں کیا، آپ تو اس ملک کی تمام عورتوں کو کوٹھوں کی زینت بنا دیں۔

شیدا: واللہ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔

ادا: مجھ کم بخت کی سرگزشت میں ایسا کیا مزا ہے جس کے سُننے کو آپ مشتاق ہیں۔ ایک ناشاد، نامراد، آوارۂ وطن ننگ خاندان کے حالات آپ کے لئے کیا دلچسپی رکھتے ہیں؟ لیکن اگر آپ سُننا ہی چاہتے ہیں تو سُنئے۔ میں نے بھی آپ کی طرح ایک اچھے خاندان میں جنم لیا تھا۔ لیکن باپ دادا کا نام لے کر اپنی سُرخروئی جتانے سے فائدہ؟ اور سچ تو یہ ہے، کہ مجھے یاد بھی نہیں۔ ہاں اتنا جانتی ہوں کہ فیض آباد میں شہر کے کنارے کسی محلّے میں میرا گھر تھا۔ میرے ابّا جان سرکاری ملازم تھے۔ لوگ انھیں مفتی جی مفتی جی کہتے تھے۔ گھر کے آنگن میں خوشیوں کی بہار تھی۔ ابھی میں نو سال کی تھی، کہ میری منگنی میری پھوپھی کے لڑکے کے ساتھ طے ہو گئی۔ میں ایک سہانی زندگی کے ننھّے منھّے خواب دیکھا

کرتی تھی، کہ اچانک یہ خواب بکھر گئے۔ ابّا سے کسی دلاور خان بدمعاش کی عداوت تھی۔ اس دشمنی کی بنا پر وہ مجھے گلی سے اُٹھالایا۔

(سٹیج پر اندھیرا۔ ایک بچّی کی چیخ و پکار۔ بچاؤ بچاؤ کی آوازیں۔ جلتی بجھتی روشنیوں میں ایک لڑکی بھاگتی جا رہی ہے۔ اس کے پیچھے ایک بدمعاش چھُرا لے کر بھاگ رہا ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ اسے پکڑ لیتا ہے۔ اور اُسے ایک عورت کے حوالے کر دیتا ہے۔ اور اس کے عوض میں کچھ پیسے لیتا ہے۔ سٹیج پر مکمل اندھیرے میں گھُنگھروؤں کی آواز سُنائی دیتی ہے۔ اور پھر جب سٹیج پر روشنی آتی ہے، تو اُمراؤ جان شیدا سے کہہ رہی ہے)

ادا: (روتے ہوئے) اس طرح کوٹھا میرا گھر بن گیا۔ بی خانم میری ماں بن گئی۔ اور لوگوں کو لبھانا میرا پیشہ بن گیا۔ امیرن سے میں اُمراؤ جان بن گئی اور اب شاید زندگی بھر اِس نام سے نباہ کرنا ہوگا۔

شیدا: نہیں امیرن میں تمھیں اس جہنّم میں رہنے نہیں دُوں گا۔

ادا: نہیں شیدا صاحب۔ مجھے اسی جہنّم میں رہنے دیجئے۔ یہ اب میرا گھر بن چکا ہے۔ میں کسی شریف گھرانے کی زینت نہیں

بن سکتی۔

شیدا: نہیں امیرن۔ تمھارا مقام کوٹھے پر نہیں ہے۔ ہمارے دل میں ہے۔ فیض آباد کے مفتی کی بیٹی ایک کوٹھے کی زینت نہیں بن سکتی۔

ادا: نہیں سلطان میری پیدائش، میرا خاندان مجھے اس ذلّت کی زندگی سے نکال نہیں سکتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جو ذات کی رنڈیاں ہیں، وہ شاید قصور وار نہیں ہیں، کیونکہ وہ ایسے ماحول، ایسے حالات میں پرورش پاتی ہیں جہاں سوائے بدکاری کے اور کسی چیز کا گذر نہیں۔ لیکن بھلے گھروں سے جو بہو بیٹیاں خراب ہو جاتی ہیں، ان کو اللہ وہاں مارے جہاں پانی نہ ملے۔

(اُٹھ کے چل دیتی ہے)

شیدا: اُمراؤ جان۔۔۔۔ امیرن۔۔۔

(شیدا اُٹھ کر اُمراؤ کے پیچھے جانے لگتا ہے، کہ مرزا رسوا اُس کا ہاتھ تھام لیتا ہے)

شیدا: مجھے جانے دیجئے۔ مَیں امیرن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

رُسوا: مَیں جانتا ہوں۔ لیکن اپنی محبّت کو یوں سرِ بازار رُسوا نہ کیجئے۔

شیدا: میں امیرن سے محبّت کرتا ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اُس کے وجود کے نور سے اپنی حویلی کو جگمگا دُوں گا۔ اُس کی ہستی سے اپنے دل کے ویرانے کو آباد کروں گا۔

رُسوا: ایسی باتوں کا فیصلہ یوں جوشیلے دعوؤں سے نہیں کیا جاتا شیدا صاحب۔ اس میں تحمّل کی ضرورت ہے۔ آپ یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

شیدا: کیا امیرن مان جائے گی۔

رُسوا: یہ آگ جو آپ کے سینے میں سُلگ رہی ہے، یک طرفہ نہیں ہے۔ امیرن کی طرف سے اگر کوئی ہچکچاہٹ ہے تو بس اتنی کہ وہ نہیں چاہتی کہ اُس کی وجہ سے آپ کی خاندانی شرافت کو داغ لگے۔

شیدا: لیکن وہ تو خود ایک اُونچے خاندان کا چشم و چراغ ہے۔

رُسوا: وہ تو ہے۔ لیکن اُس کی شرافت کے دامن پر لکھنؤ کے بازارِ حسُن میں گزاری ہوئی زندگی کے چھینٹے بھی تو ہیں۔

شیدا: ہم ان چھینٹوں کو اپنی محبّت کی پاکیزگی سے دھو دیں گے

رُسوا: آپ کے اِرادوں میں لغزش تو نہیں آئے گی؟

شیدا: ہرگز نہیں۔

رُسوا: آپ کے اُٹھے ہوئے قدم سفر کی طوالت کو دیکھ کر رُک تو نہیں جائیں گے؟

شیدا: ناممکن۔

رُسوا: تو پھر سمجھ لیجئے کہ امیرن آپ کی ہو گئی۔

(شیدا کی امّی بیگم صاحبہ کمرے میں داخل
ہوتی ہے)

شیدا: (اُٹھ کر) امی جان آپ۔

بیگم: ہمارے آنے سے آپ اس قدر حیران کیوں ہوئے۔

شیدا: آپ کا اس طرح اچانک چلے آنا۔۔۔۔

بیگم: ہمارے اچانک چلے آنے سے آپ کو حیرانی ہوئی، لیکن یہ شاید ایک عام سی بات تھی، کہ لکھنؤ کی ایک طوائف ہمارے گھر میں آکر آپ کے دوستوں کا دل لُبھا رہی تھی۔

شیدا: امی جان وہ ایک مشہور شاعرہ اُمراؤ جان اداؔ تھیں۔ جن کی شاعری کا تذکرہ آج کل ہر ادبی محفل میں ہوتا ہے۔ یہ اُن کی ذرّہ نوازی تھی، کہ اُنھوں نے ہمارے مشاعرے میں شمولیت قبول کی۔

بیگم: آپ کو شاید جوشِ جوانی میں بھلے بُرے کی تمیز بھول گئی ہو، لیکن ہم نے جس معاشرے میں پرورش پائی ہے، وہاں ایک طوائف کا دخل تو کیا اُس کا ذکر بھی ممنوع سمجھا جاتا ہے۔ آئندہ کبھی اُسے گھر میں بُلانے کی جرأت نہ کیجئے گا۔ ہم اس گھر کو بازار میں تبدیل نہ ہونے دیں گے۔

شیدا: (غصّے سے) امّی جان۔

بیگم: ہاں اگر آپ کے ذوقِ شعر کی تسکین اداؔ ہی کے کلام سے ہوتی ہے، تو آپ خوشی سے اُس کے کوٹھے پر جا کر اس کا مجرا سُن سکتے ہیں۔

شیدا: اس کی اب شاید ضرورت نہ پڑے امّی جان۔ چند دنوں کی بات ہے امراؤجان ادا اسی حویلی میں رہنے لگیں گی۔

بیگم: اس حویلی میں؟

شیدا: جی ہاں۔

بیگم: وہ تو خیر جہاں جائے گی۔ مجرا شروع کر دے گی لیکن آپ اُس کے ساتھ رہ کر کیا کریں گے؟ طبلے پر سنگت کیا کریں گے؟

شیدا: امّی جان!

بیگم: یا شاید اُس کے چاہنے والوں کے لئے پان پر کتھا چُونا لگایا کریں گے۔

شیدا: امّی جان آپ شرافت کی حد سے آگے بڑھ رہی ہیں۔

بیگم: ایک طوائف کی اتنی حمایت کہ اپنی ماں کی شان میں آپ کے مُنہ سے گستاخی کے کلمے نکلنے شروع ہو گئے۔

شیدا: اس لئے کہ آپ نے امراؤجان کو گالی نہیں دی، اپنی ہونے والی بہو کو گالی دی ہے۔

بیگم: ہماری بہو۔۔۔ کون ہماری بہو؟

شیدا: امّی جان ہم امراؤجان سے شادی کرنے والے ہیں۔

بیگم: شادی؟

شیدا: ہاں امّی جان۔ آپ کو ہم سے شکایت تھی نا کہ ہم اپنی شادی کی بات کو ہمیشہ ہنسی میں ٹال دیتے ہیں۔ اب آپ کو یہ شکایت نہیں رہے گی۔ آپ اپنے بیٹے جی اپنی بہو کا چہرہ دیکھنا چاہتی تھیں نا۔ لیجئے ہم نے آپ کی خواہشات

کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ چند ہی دنوں میں اُمراؤ جان آپ کی بہو کی حیثیت سے اس گھر میں داخل ہو گی۔ اور آپ کے گھر کو اپنے وجود سے جگمگا دے گی۔

بیگم: ننھے تم میرے مُنہ پر تھپڑ مار رہے ہو۔

شیدا: امّی جان!

بیگم: ہم نے اپنے گھر میں بہُو کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ سُننے کی خواہش ضرور کی تھی، لیکن گھنگرؤں کی جھنکار نہیں۔ ہم اپنی بہُو کی شرمیلی مُسکان دیکھنے کے خواہش مند تھے شیدا صاحب، گاہکوں کے دل کو لُبھانے والے بے باک قہقہے نہیں۔ ہم نے آپ کو گھر میں بہُو لانے کو کہا تھا، طوائف نہیں۔

شیدا: امّی اگر آپ اپنے اکلوتے بچّے کی خوشیوں کا محل اپنی ہٹ کی ٹھوکروں سے مسمار کرنا چاہتی ہیں، تو بڑے شوق سے کیجئے۔ ہم اُف تک نہیں کریں گے۔

بیگم: تیری پرورش میں مجھ سے کیا کمی رہ گئی تھی بیٹا جو تو اپنی خوشیوں کی تلاش کوڑے کے ڈھیر میں کر رہا ہے۔ میرے دُودھ میں کون سا زہریلا پن تھا، جس کے عوض آج تُو نے مجھے ایک بازاری عورت کے برابر لا کھڑا کیا ہے۔

شیدا: امی جان اُمراؤ جان ایک پیدائشی طوائف نہیں ہے۔ حالات کی مجبوریوں نے اُسے کوٹھے کی زینت بنا دیا۔ ورنہ وہ بھی ہماری طرح ایک اُونچے خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ اُس کے والد فیض آباد کے مفتی تھے۔ اس کے بہن بھائی آج بھی عزّت سے رہ رہے ہیں۔ اس معصوم بچّی کو

اُس کے خاندانی دشمن نے اغوا کرکے لکھنؤ کی ایک رنڈی کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ ہم پوچھتے ہیں کیا کوٹھے پر پاؤں رکھتے ہی اُس کی خاندانی شرافت کا خاتمہ ہو گیا؟ اگر ایسا ہے، تو ان لوگوں کے بارے میں کیا کہیں گی۔ جو ان کوٹھوں کی رونق کا سبب بنتے ہیں؟

بیگم: ہم بحث میں نہیں پڑنا چاہتے؟ لیکن آپ یہ اچھی طرح جان لیجئے، کہ اُمراؤ جان اگر اس گھر میں داخل ہوئی تو اُسے ہماری لاش پر سے گذرنا ہوگا۔

شیدا: امّی جان!

بیگم: کان کھول کر سن لو۔ برخوردار۔ ہم یہ شادی ہرگز نہ ہونے دیں گے۔

(غصّے سے یہ کہہ کر بیگم باہر نکل جاتی ہیں)

(پردہ)

دُوسرا ایکٹ

پہلا منظر — دوپہر کا وقت

(اُمراؤ جان اپنے کوٹھے پر بیٹھی غزل گنگنا رہی ہے۔ اس کے پاس بی خانم بیٹھی ہے۔)

زاہد سے گفتگو ہو کہ ناصح سے بحث ہو
بنتی نہیں ہے ذکر کسی کا کئے بغیر

جاتے ہیں جان بیچ کر بازارِ عشق میں
ہم آئیں گے نہ حسن کا سودا کئے بغیر

وعدہ ہو یا کہ قول وہ ایسے ہیں نادہند
ملتا نہیں کچھ اُن سے تقاضا کئے بغیر

ہر چند اس میں آپ ہی بدنام کیوں نہ ہوں
باز آئیں گے نہ وہ میرا چرچا کئے بغیر

(مرزا رسوا بہت سے تحفے لئے داخل ہوتا ہے)

ادا: تسلیم عرض کرتی ہوں رسوا صاحب۔ تشریف رکھئے۔ کہئے اس وقت کیسے؟

رسوا: آپ اندازہ لگائیے۔

ادا: آپ کے ہاتھ میں تحفوں کے انبار سے تو پتہ چلتا ہے کہ آپ اپنی کسی محبوبہ کو ملنے جا رہے ہیں اور دم لینے کے لئے یہاں رک گئے۔

رسوا: میں اور محبوبہ!

بی خانم: کیوں رسوا صاحب، عمر کی ایسی کونسی منزل میں ہیں آپ جو محبوبہ کے نام سے ہی گھبرا گئے۔

رسوا: ؎ ہوا بھی، ابر بھی، گلزار بھی، شراب بھی ہو
یہ سب بھی ہو، مگر اگلا سا وہ شباب بھی ہو

بی خانم: اے ہے ایسا کون سا بڑھاپا آ گیا۔

رسوا: اب آپ کی سی جوانی کوئی کہاں سے لائے۔ آپ کے عاشق تو اب بھی شہر کے کونوں میں بکھرے ہوئے مل جائیں گے۔

بی خانم: اُڑالو ہنسی مرزا رُسوا۔ لیکن اتنا کہہ دُوں کہ نہ ہمارے زمانے کے سے عاشق اب ملیں گے نہ معشوق۔ دیکھ لو یہ جو ہمارے گھر کے باہر پڑے ملتے ہیں اور جنھیں آپ سب لوگ دیوانے میاں کہتے ہیں، ان کی جوانی میں مجھ سے آشنائی ہوئی۔ ماں باپ نے کہیں شادی ٹھہرادی۔ آپ مانجھے کا جوڑا پہن کر مجھے دکھانے آئے۔ میں نے مانجھے کے جوڑے کے پُرزے پُرزے کر دیئے۔ ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئی کہ میں تو نہ جانے دُوں گی۔ اس بات کو چالیس برس ہو گئے۔ آج تک تو گھر نہیں گئے۔ کہو، ہے کوئی ایسا تمھارا بھی؟

رسوا: کہاں بی خانم اتنی ہمّت کہاں ہے ہم میں۔ زندگی بھر یہی خیال رہا کہ:

ہاں اے نگاہِ شوق مناسب ہے احتیاط
ایسا نہ ہو کہ بزم میں چرچا کرے کوئی

ادا: اگر اس طرح احتیاط برتیں گے تو زندگی بھر اکیلے رہ جائیں گے مرزا صاحب۔

رسوا: اب زندگی رہ ہی کتنی گئی ہے اور پھر اس باقی زندگی میں دوستوں کی اتنی ذمّہ داریاں ہیں مجھ پر کہ اُن سے فرصت پاؤں تو کچھ اپنا سوچوں۔

ادا: کس کی دوستی کا فرض آپ کو یوں کشاں کشاں لئے پھرتا ہے؟

رُسوا: یہ دوطرفہ دوستی ہے امراؤ بیگم۔ آپ کی دوستی اور رشیدا صاحب کی دوستی نے مجھ پر بہت سے فرض عائد کر دیئے ہیں۔

اس وقت میں اُن کی طرف سے یہ تحفے آپ کی خدمت میں
پیش کرنے آیا ہُوں۔ اور ساتھ ہی اُن کی طرف سے شادی کا
پیغام لایا ہُوں۔ کہئے آپ دونوں کو یہ رشتہ منظور ہے ؟

ادا: شیدا صاحب نے اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کر لیا
ہے نا؟

رسوا: دیکھئے اُمراؤ بیگم۔ میری اُن کی دوستی بہت پُرانی ہے۔
وہ اگر آپ سے شادی کرنا چاہتے ہیں، تو دُنیا کی کوئی
طاقت اُن کا راستہ نہیں روک سکتی۔ آپ اپنی طرف سے
منظوری دیجئے، تاکہ نکاح کی تاریخ مقرّر کی جاسکے۔

ادا: مَیں کیا کہہ سکتی ہُوں۔ زندگی کے اِس پہلو کے بارے میں تو مَیں
نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اس سہانی زندگی کا خواب میری
آنکھوں میں کبھی نہ سمایا۔ مَیں تو سمجھتی تھی کہ ہماری زندگی کوٹھے
سے شروع ہو کر کوٹھے پر ختم ہو جاتی ہے۔ وہ جو لڑکیاں سوچا
کرتی ہیں کہ کوئی شہزادہ سفید گھوڑے پر سوار ہو کر آئے گا
اور انھیں اپنے ساتھ لے جائے گا، ہماری زندگی میں ایسی
سوچ بچار کا کوئی مقام نہیں۔

رُسوا: لیکن اِس کے باوجود ایک شہزادہ آپ کے دروازے پر
آ کھڑا ہُوا ہے۔

ادا: ؎ ایک شاطر چور دل میرا چُرا کر لے گیا
پاسباں کم بخت سب سوتے کے سوتے رہ گئے

رُسوا: اس شاطر چور کے بارے میں اب آپ کا کیا فیصلہ ہے؟

ادا: کیا کہوں کیا نہ کہوں میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔

رسوا: مطلب ہے آپ کی طرف سے ہاں ہو گئی۔

ادا: وہ کیسے:

رسوا: کہنے والے کہتے ہیں کہ عورت کے انکار کو اقرار سمجھنا چاہئیے اور آپ تو ماشاءاللہ پوری طرح انکار بھی نہیں کر رہیں۔

(تینوں ہنستے ہیں)

رسوا: کیوں بی خانم آپ کی طرف سے کچھ ارشاد نہیں ہوا؟

بی خانم: مَیں کیا کہہ سکتی ہوں؟

رسوا: کیوں، اِس بارے میں آپ کچھ نہیں کہیں گی؟

بی خانم: مَیں انکار کروں تو لوگ کہیں گے کہ بی خانم کو یہ پسند نہیں تھا کہ اُس کے ہاتھ میں آئی ہوئی سونے کی چڑیا اُڑ جائے۔ لوگ کہیں گے کہ آخر رنڈی تھی نا کفن کا چونگا کیا؟

رسوا: کیا مطلب؟

بی خانم: مطلب اس محاورے کا یہ ہے کہ جب کوئی طوائف ڈھلتی عمر میں کسی کے گھر جا بیٹھتی ہے تو تجربہ کار تماش بین اُس کے بارے میں کہا کرتے ہیں کہ اس طوائف نے کفن کا چونگا کیا۔ یعنی مرتے مرتے کفن لے مری۔ مَیں اگر اُمراؤ کے راستے میں آؤں گی تو لوگ کہیں گے کہ اسے اس لئے نہ جانے دیا کہ کفن دفن کون کرے گا بی خانم کا۔

ادا: اماں!

بی خانم: بیٹی میں اِسی کوٹھے پر پیدا ہوئی۔ اور اسی پر مر جاؤں گی۔

ماں کی ممتا، باپ کا پیار، بہن بھائیوں کی چاہت
سے مَیں آشنا نہیں ہوں۔ آج اگر مَیں یہ کہوں کہ امراؤ سے
جُدا ہوتے ہوئے مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میری
اپنی بیٹی گھر سے رُخصت ہو رہی ہے تو لوگ کہیں گے
"لیجئے، رنڈیوں کے دلوں میں بھی ممتا جاگنے لگی"۔

رُسوا: بی خانم، آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں؟

بی خانم: اِس لئے کہ مَیں نے امراؤ کو پیٹ سے نہیں جنا، بازار میں روپے دے کر خریدا تھا۔ میں کیسے دکھا سکتی ہُوں کہ اسے آنگن میں کھیلتے دیکھ کر میرے دل میں خوشیوں کے طوفان اُمڈ پڑے تھے۔ اسے جوان ہوتے دیکھ میرے دل میں اُنہی ولولوں، اُنہی اندیشوں نے گھر کر لیا تھا، جو ایک جوان بیٹی کی ماں کے دل میں اُٹھتے ہیں۔ اس لئے بیٹا میں اس معاملے میں بولنے والی کون؟

ادا: نہیں ماں یُوں نہ کہو۔ اگر تمھیں پسند نہ ہو، تو میں اس رشتے سے انکار کر دُوں گی۔

بی خانم: میری پسند پوچھتی ہے تو سُن۔ میرا جی چاہتا ہے کہ مَیں سلطان شیدا کے گھر جاؤں اور اُس کی ماں کے قدموں پر سر رکھ دُوں۔ اُس عظیم ماں کے قدموں پر جس نے دُنیا والوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے میری معصوم بیٹی کو وہ مقام عطا کیا ہے جس پر اُس کا حق تھا اور حق ہے۔

رُسوا: (ذرا سا شرمندہ ہو کر کھانستا ہے) یُوں ہے بی خانم کہ شیدا صاحب کی ماں نے پُورے طور پر اس رشتے کے

بارے میں اپنی رضامندی ظاہر نہیں کی۔

بی خانم: مطلب یہ کہ یہ رشتہ شیدا کی ماں کی مرضی کے خلاف ہو رہا ہے۔

رُسوا: دیکھئے نا یوں ہے کہ۔۔۔۔

بی خانم: اگر یہ بات ہے تو کان کھول کر سن لیجئے مرزا رُسوا، مَیں اپنی لاڈلی بیٹی کی شادی ہرگز ایسے گھر میں نہیں کر سکتی، جہاں اُسے وہ مرتبہ نہ ملے جو بہو بیٹیوں کو ملتا ہے۔ اگر اُسے شیدا کی رکھیل بن کر ہی رہنا ہے تو پھر مجھ بدنصیب کے کوٹھے میں کیا برائی ہے۔ یہاں ہر روز شیدا جیسے سینکڑوں رئیس جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔

رُسوا: مَیں سمجھتا ہوں اگر آپ معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ تو اس کو آسانی سے سلجھایا جا سکتا ہے۔ مَیں نے پتہ لگوایا ہے کہ اُمراؤ کی ماں اور بھائی زندہ ہیں۔ اگر انھیں یہاں لانے میں ہم لوگ کامیاب ہو جائیں تو شیدا کی امّی جان کو اس رشتے پر اعتراض نہیں ہوگا۔ مفتی صاحب کی بیگم اور صاحبزادے کو دیکھ کر انھیں اُمراؤ کے خاندانی مرتبے کا ثبوت مل جائے گا۔

بی خانم: یوں بھی ایسے موقعے پر اُمراؤ کی ماں کی موجودگی ضروری ہوگی۔

ادا: میری اور کوئی ماں نہیں ہے امّی۔ تم ہی میرا سب کچھ ہو۔ میں تمھارے سوا کسی کو نہیں جانتی، کسی کو نہیں پہچانتی۔

(روتے روتے بی خانم سے لپٹ جاتی ہے)

مَیں تمھیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔

بی خانم: مَیں جو کچھ کر رہی ہوں بیٹا اُسی میں تیری خوشی ہے۔ اور تو اگر زندگی میں خوش ہو جائے تو سمجھ لے مجھے میری محبّت، میرے پیار کی قیمت مل گئی۔ آپ جائیے رسوؔا صاحب اور اُمراؤ کی ماں کا پتہ لگوائیے۔

(مرزا رُسوؔا باہر نکل جاتا ہے)

(فیڈ آؤٹ)

(اس طرح کی آواز آتی ہے جیسے کوئی دروازے سے ٹکرا گیا ہو)

بی خانم: کون؟

(شراب کی مستی میں سرشار منشی اندر آتا ہے)

منشی: کتنے لوگ پوچھیں گے کہ مَیں کون ہُوں؟
ادؔا: کسی اَور نے بھی پوچھا کیا؟
منشی: پہلے آپ کے دَروازے نے پوچھا۔ پھر آپنے پوچھا۔
ادؔا: منشی جی اس وقت آپ کہاں؟
منشی: کیا بہت سویرے آ گیا ہوں؟
ادؔا: ابھی تو بس دوپہر ڈھلی ہے۔
منشی: بات یہ ہے اُمراؤ جان کہ شراب کی وجہ سے وقت کا کوئی احساس

ہی نہیں رہتا۔ جب تک نہیں پی تھی، ہر طرف اندھیرا
ہی اندھیرا تھا۔ پی لی تو چاروں طرف چراغ روشن ہو گئے۔
جب چراغ روشن ہوئے تو ہم سمجھے رات ہو گئی۔ جب
دیکھا رات ہو گئی، تو ہم مجرا سننے چلے آئے۔

بی خانم: ابھی رات نہیں ہوئی منشی جی۔

منشی: اُس کا انتظام میں ابھی کئے دیتا ہوں۔
(بوتل اس کی طرف بڑھاتا ہوا)
اس میں سے چند گھونٹ لے لیجئے۔ چراغ ہی چراغ جلتے
نظر آئیں گے۔

ادا: اصل میں بات یہ ہے منشی جی کہ میں نے مجرا چھوڑ دیا ہے۔

منشی: تو اب کیا بھجن گایا کریں گی۔

ادا: اب جو کچھ بھی گاؤں گی۔ ایک ہی شخص کے لئے گاؤں گی۔

منشی: تو گویا شادی کر رہی ہیں؟

ادا: جی ہاں۔

منشی: شیدا صاحب سے؟

ادا: جی ہاں۔

منشی: مجھے اُس دن مشاعرے میں دال میں کچھ کالا تو نظر آیا
تھا، لیکن چونکہ شراب پیئے ہوئے نہیں تھا، اس لئے
سمجھا دال میں یوں ہی اندھیرا ہے ۔ ۔ ۔ ۔
تو پھر مجرا نہیں ہوگا۔

ادا: نہیں۔

منشی: تو پھر گھر چلیں۔ اور وہاں کی رونق کا لطف اُٹھائیں۔

ادا: آپ کے گھر میں مجرا ہے کیا آج۔

منشی: گھر میں مجرا تو نہیں ہے، لیکن وہاں بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ چھ سات بچّوں کی قوّالیاں ہوتی ہیں۔ ایک عدد بیوی کا کتھک ترنت ہوتا ہے، اور اگر ہم ہوش میں ہوں، تو طبلے پر سنگت ہم خود کرتے ہیں۔

ادا: بڑا دلچسپ پروگرام ہوتا ہوگا۔

منشی: آپ کی شادی ہو جائے انشاءاللہ آپ کے گھر میں بھی ہُوا کرے گا۔

بی خانم: چلئے آپ کو دَروازے تک چھوڑ آؤں۔

(ساتھ باہر لے جاتی ہے)

(ایک وقفہ کے بعد)

ادا: (آواز دے کر) امّاں۔ کہاں رہ گئیں۔

بی خانم: (اندر آتی ہے، تو اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا ہے) دیکھو مَیں کسے لائی ہوں اپنے ساتھ۔

ادا: کون صاحب ہیں یہ؟

بی خانم: اِس کا نام انور ہے۔ یہ فیض آباد سے آیا ہے۔ اور تیری ماں اور بھائی کی سلامتی کی خبر لایا ہے۔

ادا: تُم فیض آباد سے آئے ہو بھیّا۔

انور: ہاں مَیں آپ کے گھر والوں کو جانتا ہوں۔

ادا: جانتے ہو ؟
کیسی ہے میری ماں ؟
میرے ابّا؟
میرا بھیّا؟

انور: آپ کے گُم ہو جانے کے بعد مفتی جی اس صدمے کو برداشت نہ کر سکے اور اسی غم میں ہلکان ہو ہو کر جان دے دی۔ لیکن خدا کے فضل سے آپ کی امّاں سلامت ہیں۔ آپ کی جدائی میں رو رو کر انھوں نے آنکھوں کی روشنی گنوا لی ہے۔ سوائے آپ کو یاد کرنے کے انھیں اور کوئی کام نہیں۔

ادا: اور میرا بھائی۔

انور: آپ کا بھائی ماشاءاللہ جوان ہے۔ شاہی خزانے سے تنخواہ پاتا ہے۔

ادا: شادی ہو چکی اس کی ؟

انور: جی ہاں دو بچّے بھی ہیں۔

ادا: بھیّا۔ تم میرے لئے اتنی بڑی خوشی کی خبر لائے ہو۔ اللہ تمھیں اس کا اجر دے گا۔ بتاؤ میں تمھاری کیا خدمت کروں۔

انور: مَیں عرض کر دوں گا، تو آپ گستاخی سمجھیں گی۔

ادا: نہیں نہیں، تم کہو۔

انور: آپ کے مجرے کی مَیں نے بہت تعریف سُنی ہے۔ اتنی ہمّت مجھ میں نہیں ہے کہ آ کر مجرا سُن سکوں۔

کیا آپ مجھ پر یہ کرم کر سکتی ہیں ؟

ادا : یوں تو میں تمھارے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں، لیکن مجھے معاف کرنا بھائی۔ میں نے مجرا چھوڑ دیا ہے۔

انور : میں جانتا تھا آپ انکار کر دیں گی۔ ایک مفلس و نادار کے لئے کون اپنے آپ کو تکلیف دے گا۔

ادا : یہ بات نہیں ہے بھائی۔ ایسا ہے کہ ۔ ۔ ۔

انور : کوئی بات نہیں۔ اگر آپ نہیں چاہتیں تو نہ سہی۔ اچھا اب اجازت دیجئے۔ میں فیض آباد جا کر آپ کی اماں کو آپ کی سلامتی کی خبر دوں گا۔

بی خانم : بیٹی ! انور کو یوں مایوس رخصت نہ کرو۔ وہ تمھارے لئے وہ خبر لایا ہے، جسے سننے کے لئے تمھارے کان ترستے تھے۔ ایک بار اور آخری بار اس کے لئے مجرا کر دو ۔

ادا : نہیں ماں ۔ آپ تو جانتی ہیں ۔ مجھ سے اب یہ نہیں ہو پائے گا۔

بی خانم : کیا انور کے لئے بھی نہیں ؟ تو یہ مجرا کسی انعام کی خاطر تو کر نہیں رہی، جو تیرا ضمیر تجھے ملامت کرے گا۔ کر دے بیٹا بھائی کا دل خوش ہو جائے گا۔

ادا : اچھا بلائیے سازندوں کو۔

(بی خانم اندر جاتی ہے ۔ اس کے ساتھ

سازندے سٹیج پر آتے ہیں۔ انور بیٹھ
جاتا ہے۔ اُمراؤ سازندوں کو اشارہ کرتی ہے۔
اُس کا اشارہ پاتے ہی ایک دُھن چھڑ
جاتی ہے۔ انور سُن بھی رہا ہے، اور
دروازے کی طرف دیکھ بھی رہا ہے۔ غزل
کے آخری شعر کے بعد شیدا سٹیج پر
داخل ہوتا ہے۔ وہ ایک لمحے کے لئے
اُمراؤ کو مجُرا کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔
اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے اور
وہ چیخ کر کہتا ہے)

شیدا: اُمراؤ۔

ادا: (پیچھے مُڑ کر دیکھتی ہے)
آؤ سُلطان آؤ بیٹھو۔ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔

شیدا: طوائف کسی سے ڈرتی بھی ہے، یہ مجھے آج معلوم ہوُا۔

ادا: سلطان یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔

شیدا: خبردار جو میرا نام اپنی ناپاک زبان سے لیا۔

ادا: یہ تمہیں اچانک ہو کیا گیا ہے؟

شیدا: قربان جاؤں تمھاری سادگی پر مجھُ سے پوچھتی ہو کہ مجھے ہو کیا گیا ہے؟ مَیں پوچھتا ہوں تمہیں کیا ہو گیا ہے، جو ایک نوجوان کو سامنے بٹھا کر اُس پر نچھاور ہوئی جا رہی ہو۔ اُس کے لئے ایک خاص محفل سجائی گئی ہے۔ تاکہ کوئی

دوسرا مخل نہ ہو۔

ادا: تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے سلطان۔

شیدا: ہوئی تھی۔ اب کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ تم ایک طوائف ہو اور طوائف رہنا چاہتی ہو۔ تمھیں محبّت کرنے کے لئے ایک نہیں ہزاروں نوجوان چاہئیں۔ ورنہ تمھارے دل کی تسکین نہیں ہوسکتی۔ میں بھی کیا بھولا انسان ہوں جو سمجھتا تھا کہ تم ایک پاکدامن عورت ہو۔ شکر ہے میری نظر سے یہ پردا ہٹ گیا۔

ادا: اب ہٹ گیا نا۔ اب جاؤ یہاں سے۔ تم کیا جانو محبّت کیا ہوتی ہے۔ محبّت تو ایک عبادت ہے۔ ایک تپسیا ہے۔ محبّت ایک اعتبار کا نام ہے۔ اعتماد اور بھروسے کا نام ہے۔ محبّت ایک بلبلہ نہیں ہے، جو ہوا کے ایک جھونکے سے پھٹ جاتا ہے۔ سلطان شیدا تم کیا جانو محبّت کیا ہوتی ہے۔ جاؤ جاکر اپنی امّاں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاؤ۔ تم ابھی بچّے ہو۔ محبّت بچّوں کا کھیل نہیں ہے۔

شیدا: بکواس بند کرو۔ میں تمھارے منہ سے ایک لفظ نہیں سننا چاہتا۔

ادا: چلے جاؤ یہاں سے میں تم جیسے آدمی کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔

(شیدا غصّے سے باہر نکل جاتا ہے)

انور: معاف کیجئے، میری وجہ سے ....

ادا: اس میں تمھارا قصور نہیں ہے بھائی،:

اتّفاقاتِ زمانہ سے یہ کچھ دُور نہیں
یُوں بھی ہوتا ہے بچھڑ جاتے ہیں ملنے والے

انور: اچّھا اجازت دیجئے۔ مَیں جلد از جلد آپ کے گھر والوں کو آپ سے ملانے کی کوشش کروں گا۔

ادا: اچھا خُدا حافظ!

(فیڈ آؤٹ)

دُوسرا منظر

(شیدا کا گھر۔ بیگم صاحبہ گھر کا کچھ کام
کر رہی ہیں کہ مرزا رُسوا کی آواز آتی ہے)

رُسوا: بیگم صاحبہ میں اندر آسکتا ہوں؟
بیگم: آئیے رُسوا صاحب۔ شیدا صاحب تو گھر میں نہیں ہیں۔
رُسوا: جانتا ہوں۔ میں خاص طور پر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔
بیگم: فرمائیے!
رُسوا: بیگم صاحبہ۔ میں شیدا کا دوست ہونے کے ناطے آپ کا بیٹا ہوا نا۔
بیگم: آپ کو اس رشتے پر شک کیوں ہوا؟
رُسوا: میں جانتا ہوں، آپ شیدا صاحب اور امراؤ جان

کے تعلقات کے بارے میں پسندیدہ رائے نہیں رکھتیں اور چونکہ مَیں اس رشتے کی حمایت کر رہا ہُوں اس لئے شاید مَیں آپ کی نظروں سے گر چکا ہُوں۔

بیگم: مَیں چوں کہ شیدا کی ماں ہُوں، آپ مجھ سے اُس کا بھلا بُرا سوچنے کا اختیار چھین نہیں سکتے۔

رُسوا: لیکن دوست ہونے کے ناطے کچھ میرا اختیار بھی تو ہے شیدا پر۔

بیگم: مَیں نے اس سے کب انکار کیا؟

رُسوا: اسی لئے عرض کرنا چاہتا ہُوں کہ اُمراؤ جان کو ایک طوائف سمجھنا انسانیت کی نظروں میں ایک ظلم ہوگا۔ یہ درست ہے کہ حالات نے اُسے وہاں پہنچا دیا، جہاں لوگ اُسے نفرت کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہیں لیکن اب جب کہ آپ مجھے ایک بیٹے کا حق دے چکی ہیں میری بات کا یقین کیجئے اُمراؤ جان ایک شریف خاندان کی چشم و چراغ ہے۔ ایک کوٹھے پر گزارے ہوئے اتنے سال بھی اُس کی خاندانی شرافت کی چمک دمک کو ماند نہیں کر سکے۔ طوائفوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جب کسی کو دام میں لانا چاہتی ہیں تو اُس پر مرنے لگتی ہیں۔ شاید اُن سے زیادہ کسی کو مرنا نہیں آتا۔ ٹھنڈی سانسیں بھرنا، بات بات پر رو پڑنا، کنوئیں میں پیر لٹکا کر بیٹھ جانا، سنکھیا

کھالینا، یہ سب کچھ وہ کرتی ہیں، جب کسی کو فریب میں لانا ہوتا ہے۔ لیکن اُمراؤ جان نے شیدا صاحب سے ہمیشہ یہی التجا کی ہے کہ وہ اُن کے قابل نہیں ہے۔

بیگم: رُسوا صاحب آپ چاہتے کیا ہیں؟

رُسوا: صرف یہ کہ اس شادی کی منظوری آپ بخوشی دے دیجئے۔ آپ یقین مانیے، اُمراؤ کو گھر میں لاکر آپ کی خاندانی شان میں فرق نہیں آئے گا۔

بیگم: مجھے آپ کی بات منظور ہے لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔

رُسوا: فرمائیے۔

بیگم: نکاح کے وقت اُمراؤ کی ماں اور بھائی موجود ہونے چاہئیں۔ کسی کو یہ نہ لگے، کہ ہم اُس کا ڈولا کسی شریف گھر سے نہیں ایک کوٹھے سے اُٹھا کر لائے ہیں۔

(اچانک شیدا داخل ہوتا ہے)

شیدا: ڈولی کہیں سے اُٹھ کر آئے، اُس کے اندر تو ایک طوائف ہی ہوگی۔

رُسوا: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

شیدا: بہت ہو چکا یہ کھیل رُسوا صاحب۔ اب یہ ناٹک بند کیجئے۔

رُسوا: یا اللہ یہ میں کیا سُن رہا ہوں۔

شیدا: آپ تو صرف سُن رہے ہیں، مَیں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہُوں کہ اُمراؤ جان ایک نوجوان لڑکے کو اپنے سامنے بٹھا کر عشوہ طرازیاں کر رہی تھی۔ اُس کے لئے ایک خصُوصی مجُرا کیا جا رہا تھا دوپہر کے وقت تا کہ اور کوئی مخل نہ ہو۔

رُسوا: آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے شیدا صاحب۔

شیدا: ہوئی تھی۔ اب نہیں ہے۔ مَیں جسے پاک دامن سمجھتا تھا، وہ گُناہ کی لذّت سے اتنی مانوس ہو چکی ہے کہ گُناہ کے بغیر زندگی گزارنا اُس کے بس کی بات نہیں۔ گُناہ بھی ایک طرح کا نشہ ہے۔ جیسے شرابی کے لئے شراب جیسے افیمچی کے لئے افیم۔ اُمراؤ جان اِس نشے میں اتنی سرشار ہیں کہ اگر وہ ہوش میں آ جائیں تو شاید زندہ نہ رہیں۔

رُسوا: شیدا صاحب!

شیدا: خُدارا مجھے اکیلا چھوڑ دیجئے۔ مَیں اُس کا نام بھی سُننا نہیں چاہتا۔

رُسوا: شیدا۔

شیدا: جائیے۔ خُدارا چلے جائیے۔

(رُستوا آہستہ آہستہ باہر نکل جاتا
ہے۔ بیگم کی آنکھوں میں کامیابی
کی جھلک ہے)

(فیڈ آؤٹ)

تیسرا منظر

(اُمراؤ جان اکیلی کمرے میں بیٹھی ہے۔
کہ ایک بوڑھی عورت اور اُس کے پیچھے
ایک جوان لڑکا اندر آتے ہیں۔)

ادا: آؤ اماں۔ کس سے ملنا ہے آپ کو؟
بڑھیا: ادھر آ بیٹا۔ مجھے اچھی طرح نظر نہیں آتا۔

(اُمراؤ نزدیک آتی ہے)

(بڑھیا چراغ چہرے کے قریب لاکر
دیکھتی ہے)

کیا نام ہے تمھارا بیٹا؟

ادا: امراؤ جان۔

بڑھیا: امراؤ جان! نہیں۔ نہیں تمھارا نام امراؤ جان نہیں۔ تم امیرن ہو۔ ہو نا؟

(امراؤ کچھ بولتی نہیں)

تم فیض آباد کی ہو نا؟

ادا: ہاں ماں۔

بڑھیا: تم بنگلے والے مفتی جی کی لڑکی ہو نا؟

ادا: ہاں ماں۔ تو نے کیسے پہچان لیا؟

بڑھیا: کیوں ری، میں اپنے خون کو نہیں پہچانوں گی؛ میری ننھی منی امیرن تو کہاں چلی گئی تھی؟ میں نے تیری تلاش میں اپنی آنکھیں گنوا دیں ری۔ تو کہاں گم ہو گئی تھی؟

(امراؤ روتی ہوئی اس سے لپٹ جاتی ہے)

یہ تیرا بھائی ہے ری۔ دیکھ کتنا جوان ہو گیا ہے۔ یہ تیرے باپ کی جگہ کچہری جاتا ہے۔

ادا: بھائی۔

جوان: (پیچھے ہٹ کر)
تم اس کوٹھے پر رہتی ہو۔

ادا: ہاں۔

جوان: (سر نیچا کر کے)
خوب گھرانے کا نام روشن کیا ہے۔

ادا: مَیں کیا کہوں؟

جوان: ہم تو سمجھے تُم مَر گئیں تھیں۔ مگر تُم اب تک زندہ ہو۔

ادا: بے غیرت زندگی تھی نہ مَری۔ خدا کہیں جلد موت دے۔

جوان: بے شک۔ اس زندگی سے موت لاکھ درجہ بہتر تھی۔ تمھیں تو چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیئے تھا۔ کچھ کھا کے سو رہی ہوتیں۔

ادا: خود اتنی سمجھ نہ تھی۔ نہ ہی آج تک کسی نے یہ نیک صلاح دی۔

جوان: اگر ایسی ہی غیرت دار ہوتیں تو مرزا رُسوا کو بھیج کر ہمیں نہ بُلوایا ہوتا۔

ادا: اتنی خطا مجھ سے ضرور ہوئی ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا ....

جوان: اچھا اب تو معلوم ہو گیا۔

ادا: اب کیا ہوتا ہے۔

جوان: (غصّے میں)

اب کیا ہونا ہے؟ اب (گلے پر ہاتھ رکھ کر)
یہ ہونا ہے۔

(اتنے میں بی خانم پان لے کر آتی ہے)

اری دَوڑو۔ کوئی میری لڑکی کو مارے ڈالتا ہے۔

جوان: (ہاتھ ہٹا کر)
عورت کو کیا ماروں۔ اور عورت بھی کون میری اپنی بڑی ۔ ۔ ۔ ۔

(رونے لگتا ہے)

ادا: بھائی۔

جوان: مجھے بھائی مت کہہ آپا۔ تو اب ہماری نہیں رہی۔ تجھ سے ملنا بھی ہمارے لئے خطرے سے خالی نہیں۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔

ادا: جاؤ بھائی۔ تم اپنے بچوں پر سلامت رہو۔ جیتی رہی تو کبھی نہ کبھی خیر و عافیت سن ہی لیا کروں گی۔

جوان: برائے خدا کسی سے ہمارا ذکر نہ کرنا۔

ادا: نہیں کروں گی۔

جوان: (بُڑھیا سے)
چلو ماں۔

بُڑھیا: میں اپنی امیرن کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔

جوان: چلو ماں بیکار ضد نہ کرو۔

ادا: جاؤ ماں۔ بھائی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تمھیں میرے سائے سے بھی دُور رہنا چاہیئے۔

(بُڑھیا روتی ہوئی اُس جوان کے ساتھ
باہر چلی جاتی ہے)

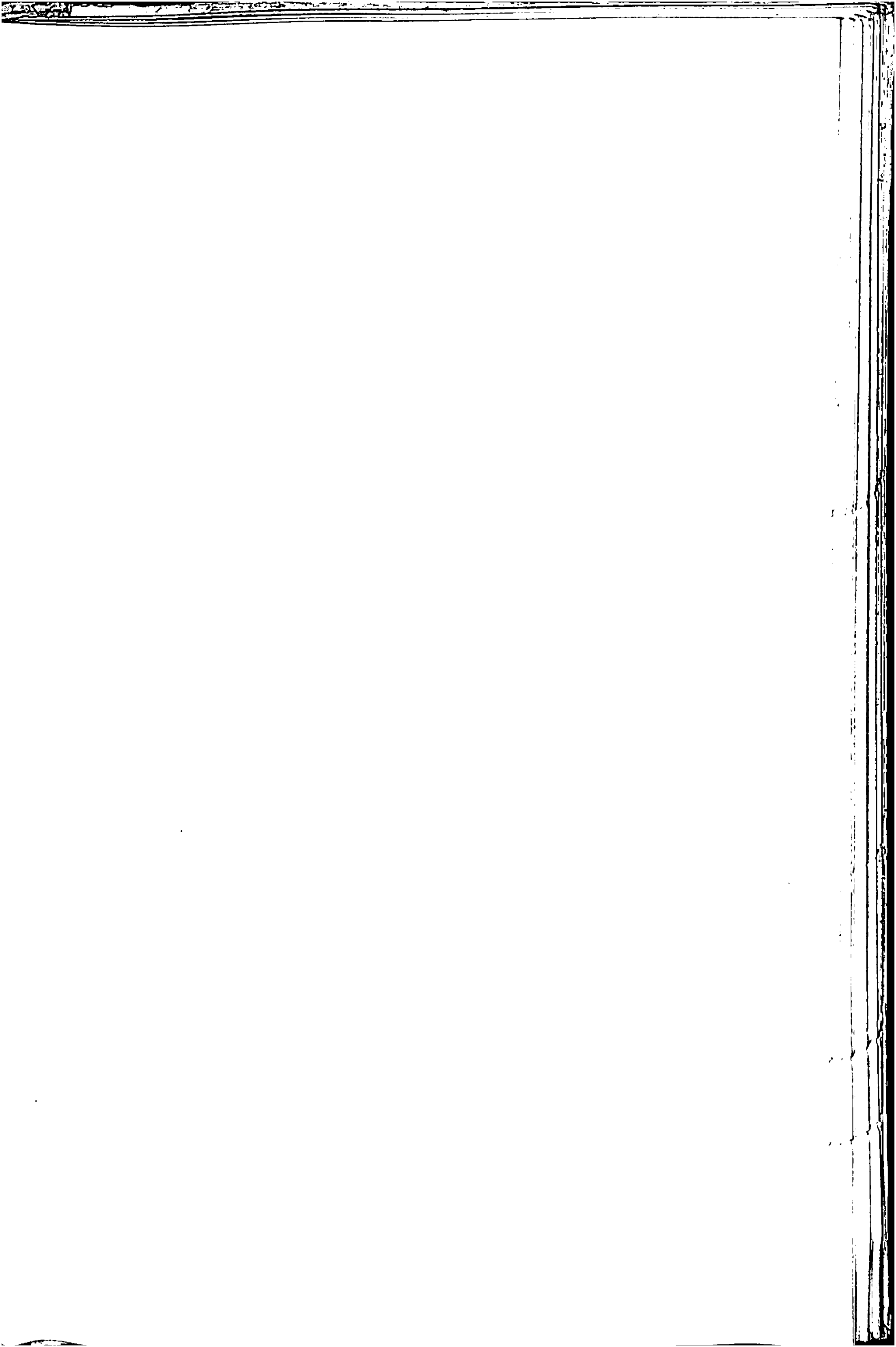
بی خانم: یہ کون لوگ تھے اُمراؤ۔

ادا: مَیں کیا جانوں کون تھے؟ طوائف کے مکان پر ہزاروں لوگ آتے ہیں، کیا پتہ کون تھے؟

بی خانم: مَیں تو ڈر گئی تھی۔

ادا: ڈرنے کی کوئی بات نہیں اماں۔ اب خطرہ ٹل گیا ہے۔ اب خطرہ بالکل ٹل گیا ہے۔

(فیڈ آؤٹ)



چوتھا منظر — لکھنؤ کا ایک بازار

(راہ چلتے ہوئے رُسوا منشی سے ٹکرا جاتا ہے)

رُسوا: اوہ منشی جی آپ؟

منشی: اور آپ کیا سمجھے تھے، کہ راستے کا پتھر ہوں جو ٹھوکر مار دی۔

رُسوا: لیجئے۔ انجانے میں جو ٹکراؤ ہوا آپ اُس کا بھی بُرا مان گئے۔

منشی: بُرا تو شاید نہ مانتے۔ لیکن ٹکّر لگنے سے میرا مُنہ دوسری طرف ہوگیا۔ اب یہ بھی یاد نہیں

کہ مَیں کِس طرف جا رہا تھا۔

رُسوا: آپ فرمائیے کہاں جانا ہے۔ مَیں پہنچا دُوں گا۔

مُنشی: یہ پتہ ہو تو ہم اپنے آپ نہ چلے جائیں۔

رُسوا: آج شاید کچھ زیادہ پی گئے ہیں۔

منشی: آپ تو جانتے ہیں مرزا رُسوا کہ میں ناپ کے پیتا ہُوں۔ زیادہ نہیں پیتا۔ لیکن ہُوا یہ کہ جب مَیں ناپ کے حساب سے پی کر اُمراؤ جان کے کوٹھے پر پہنچا تو وہ کہنے لگیں کہ انھوں نے مجُرا بند کر دیا ہے۔ مَیں گھر کو جانے لگا تو پھر پتہ نہیں کیا ہُوا۔ کہ ان کے دَروازے کے باہر ہی بیٹھ گیا۔

رُسوا: پھر کیا ہُوا؟

منشی: پھر کیا ہُوا کہ اندر سے مجُرے کی آواز آئی۔ ہم نے سوچا یہ کیا؛ اتنے میں شیدا صاحب کو اندر جاتے دیکھا۔ پھر اُسی دَم باہر آتے دیکھا۔

اللہ چہرے پر کیا جلال تھا۔ یُوں لگتا تھا، کسی کا قتل کر دیں گے۔ ہم تو بھیّا رَاستے سے ہٹ گئے۔ پھر جب ایک نوجوان باہر نکلا تو ہم نے پُوچھا کہ بھائی کیا اندر مجُرا شروع ہو گیا۔ کہنے لگا کہ خاص ہمارے لئے ہو رہا تھا۔ ہم نے پُوچھا کیوں بھئی تمھیں کوئی سُرخاب کے پر لگے ہیں۔ کہنے لگا ہاں لگے ہیں۔ ہم نے کہا، ہمیں بھی لگا دو۔ اُس نے ہمیں شراب

پلادی۔

رُسوا: پھر کیا ہوا۔

منشی: وہ کہنے لگا ہم نے اُمراؤ جان کو اُلّو بنایا۔ کہ ہم فیض آباد سے اُس کے گھر والوں کی خبر لائے ہیں۔ اُس کے عوض ہم نے مجرے کی فرمائش کی۔ انھوں نے سُنا دیا۔

رُسوا: لیکن اُس نے اُمراؤ جان کو اُلّو کیوں بنایا۔

منشی: کیونکہ شیدا صاحب کی امی جان نے اسے سَو اشرفیاں دی تھیں۔ اب اشرفیاں کیوں دیں، یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر اشرفیاں ہی دینی تھیں تو مجھے دے دیتیں۔ آپ کو کچھ معلوم ہے رُسوا صاحب کہ اُس نوجوان کو اشرفیاں کیوں ملیں؟

رُسوا: ابھی سب معلوم ہو جائے گا۔ آپ میرے ساتھ چلئے۔

منشی: ہم تو اپنے آپ چل رہے ہیں۔ آپ خواہ مخواہ ہمیں گھسیٹ رہے ہیں۔

(پردہ)

پانچواں منظر

(رشیدا پریشان حال گھر میں بیٹھا ہے
کہ رُسوا اور منشی اندر آتے ہیں۔)

شیدا: (غصّے سے)
رُسوا صاحب! مَیں آپ سے گذارش کر چکا ہوں
کہ۔۔۔۔

رُسوا: ۔۔۔۔۔۔ مَیں آپ کے مکان کے قریب نہ پھٹکوں،
لیکن مَیں ڈھیٹ آدمی ہُوں، پھر چلا آیا۔

منشی: اور مَیں چونکہ ڈھیٹ آدمی نہیں ہوں، اپنے آپ
نہیں آیا۔ مجھے گھسیٹ کر لایا گیا ہے۔

شیدا: آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟

رسوا: مَیں یہ کہنا چاہتا ہُوں کہ آپ اُمراؤ جان ادا کے
ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔

شیدا: میں زیادتی کر رہا ہوں ؟ وہ کیسے ؟

رسوا: آپ ایک پاک دامن عورت پر جھوٹا الزام لگا رہے ہیں۔

شیدا: جھوٹا الزام ! امراؤجان کا ایک خوب صورت نوجوان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر رقص کرنا جھوٹ تھا ؟ اس کے سامنے عشقیہ غزلیں گانا جھوٹ تھا ؟ اس کی ادائیں، اُس کے غمزے جھوٹ تھے ؟ جھوٹ تھی اس کی آنکھوں میں اُمڈتی ہوئی مستی، جھوٹ تھی اُس کے گھنگروؤں کی جھنکار۔ مجھ میں اور آپ میں فرق یہ ہے کہ میں نے دیکھا ہے اُمراؤجان کا وہ جلوہ، جو آنکھوں کو جُھلسا کے رکھ دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں۔

رسوا: میں پوچھتا ہوں وہ ایسا کیوں کرے گی ؟

شیدا: اِس لئے کہ ناچنا گانا امراؤجان کی زندگی کا حصّہ بن چکا ہے۔ مجرا کرنے جو خوشی اُسے ملتی ہے، وہ کسی کی بیوی بن کر کہاں مل سکتی ہے۔ ایک طوائف کا دل کس طرح دھڑکتا ہے۔ اُس میں کون سی خواہشات پرورش پاتی ہیں، اس کا آپ کو اندازہ نہیں ہے رسوا صاحب۔

رسوا: مجھے اندازہ نہیں شیدا صاحب ؟ میں نے اپنی تمام زندگی طوائفوں کے کوٹھوں پر گزار دی ہے۔ مجھے اندازہ نہیں ؟ اُمراؤجان کیا ہے، یہ جانتا ہے تو

پچھلے چند دنوں میں گذرے ہوئے واقعات پر غور کیجئے۔ محبّت کی پیش کش آپ کی طرف سے ہوئی، اُس کی طرف سے نہیں۔ شادی کا پیغام آپ کی طرف سے گیا، اُدھر سے نہیں آیا۔ اگر اُمراؤ کو اپنے موجودہ زندگی اتنی عزیز ہوتی تو یہ سارا تماشہ رچنے کی ضرورت کیا تھی؟

شیدا: تو پھر وہ ناٹک جو میرے سامنے کیا گیا، وہ کیا یہ جاننے کے لئے کیا گیا تھا کہ میرے دامن پر اگر آگ کی چنگاری پھینکی جائے تو کیا خاموش جلنا پسند کروں گا یا نہیں۔ وہ رقص، وہ مجرا شاید میری محبّت کا ایک امتحان تھا۔

رُسوا: وہ کیا تھا، ذرا منشی جی سے پوچھئے۔

منشی: شُکر ہے۔ آپ لوگوں کو خیال تو ہُوا کہ مَیں بھی یہاں موجود ہُوں۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے میں ایک چھڑی تھا، جس کا آسرا لے کر آپ یہاں پہنچے اور پھر کونے میں پھینک دی۔

رُسوا: منشی جی آپ شیدا صاحب کو سچ سچ بتائیے کہ آپ نے کیا دیکھا۔

منشی: سچ سچ بتا دوں؟

رُسوا: ہاں:

منشی: (دایاں ہاتھ اُوپر اُٹھا کر جس میں بوتل ہے) مَیں اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہُوں کہ مَیں جو کچھ

کہوں گا، سچ کہوں گا اور سچ کہنے کے بعد کچھ اور نہیں کہوں گا۔

شیدا: کیا کہنا چاہتے ہیں آپ ؟

منشی: وہ جو لڑکا جسے اُمراؤ جان مجرا سُنا رہی تھی ایک چال تھی آپ کو بھڑکانے کی۔

شیدا: آپ نے کہہ دیا اور ہم مان لیں۔

منشی: گویا آپ کو ہماری زبان پر اعتبار نہیں۔

شیدا: آپ کی موجودہ حالت دیکھ کر کون آپ کی زبان پر اعتبار کرے گا۔

منشی: گویا آپ سمجھتے ہیں کہ ہماری حالت اچھی نہیں۔ دیکھئے شیدا صاحب اگر آپ اس طرح ہم سے مذاق کریں گے، تو ہم آپ سے رُوٹھ جائیں گے ہاں۔

رسوا: منشی جی۔ پوری بات بتائیے نا کہ آج اُمراؤ کے کوٹھے پر آپ نے کیا دیکھا؟

(رُک کر دیکھتا ہے تو منشی نہیں ہے)

اے منشی جی! کہاں چلے گئے آپ؟

(آواز دے کر)

منشی جی! منشی جی !!

منشی: (باہر سے)
آ رہا ہوں۔

(اندر آتا ہے تو اُس کے ساتھ انور ہے)

رُسوا: آپ کہاں چلے گئے تھے۔ اور یہ صاحب کون ہیں آپ کے ساتھ۔

منشی: یہ ثبوت ہے۔ شیدا صاحب نے ثبوت مانگا تھا۔ مَیں نے ادھر دیکھا تو اچانک میری نظر اس چلتے پھرتے ثبوت پر پڑ گئی۔ یہ ثبوت یہاں کیسے پہنچا، ابھی تک یہ مجھ پر واضح نہیں ہوا، لیکن میں اسے لے آیا ہوں۔ اب ذرا پوچھئے کہ مَیں اکیلا اس کو کیسے لے آیا ہوں۔

رُسوا: کیسے لے آئے؟

منشی: جیسے گدھے کو گھاس دکھائیں تو وہ آپ کے پیچھے چلا آتا ہے، اِن حضرت کو آپ اشرفی دکھا دیجئے، یہ آپ کے پیچھے چلے آئیں گے۔

شیدا: یہ کون ہے؟

منشی: اگر آپ میری اس شیشی میں سے ایک گھونٹ پی لیں تو آپ کی آنکھوں میں جو روشنی پیدا ہو گی اس میں آپ کو صاف دکھائی دے گا کہ یہ تو وہی ہے جسے اُمراؤ جان نے مجرا سُنا رہی تھیں۔

شیدا: ہاں یہ تو وہی ہے۔

منشی: اب اس سے پوچھئے کہ اُمراؤ جان اسے مجرا کیوں سُنا رہی تھیں۔

انور:　　میں کچھ نہیں جانتا۔

(منشی اُسے دھکّا دے کر گرا دیتا ہے)

منشی:　　دیکھو بیٹا! کیوں میری بوڑھی ہڈّیوں کو تکلیف دیتے ہو۔ اپنے آپ بولتے جاؤ گے، تو مجھے ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

انور:　　(ڈرتے ہوئے)
میرا کوئی قصور نہیں۔ میں بالکل بے قصور ہوں۔

منشی:　　تقریر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس سیدھی سادھی زبان میں یہ بتاؤ کہ تم وہاں کیا بن کر گئے تھے؟

انور:　　اُمراؤ جان کے گاؤں کا ایک آدمی۔

منشی:　　اور وہاں کیا لے کر گئے تھے؟

انور:　　اُس کے گھر والوں کی خبر۔

منشی:　　اور وہاں جانے پر تمھیں آمادہ کس نے کیا؟

انور:　　لالچ نے۔

منشی:　　اور یہ لالچ تمھیں کس نے دیا؟

انور:　　یہ ہم نہیں بتائیں گے۔

(منشی ایک اور دھکّا دیتا ہے)

گویا تم ہماری ورزش ضرور کراؤ گے۔

انور: مجھے شیدا صاحب کی امّی جان نے بھیجا تھا۔ مقصد شیدا صاحب کے دل میں غلط فہمی پیدا کرنا تھا۔

شیدا: (چلّا کر)
امّی جان!

بیگم: (اندر آکر)
اس قدر چلّا کیوں رہے ہو بیٹا۔ کیا ہوا؟

شیدا: اندھیرے میں ڈر گیا تھا۔

بیگم: کیسا اندھیرا۔ مجھے تو کہیں اندھیرا نظر نہیں آتا۔

شیدا: اندھیرا تو میرے تن بدن پر چھایا ہوا ہے۔ آپ کو کہاں سے نظر آئے گا، بیگم صاحبہ؟

بیگم: کیوں بیٹا، مجھے بیگم صاحبہ کیوں کہہ رہے ہو۔ میں تو تمھاری امّی ہوں۔

شیدا: (نفرت سے)
امّی۔ میری ماں تھی تبھی تو میرے دل میں نفرت کے بیج بو دیئے۔ ماں تھی تبھی تو میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔ ماں تھی تبھی تو میرا چین لوٹ لیا میری نیند لوٹ لی۔

بیگم: ہم اس بیہودہ گفتگو کا مطلب پوچھ سکتے ہیں؟

شیدا: (انور کو کھینچ کر سامنے لاتا ہے)

اپنے اس زرخرید غلام کو دیکھ لیجئے۔ مطلب اپنے آپ سمجھ میں آجائے گا۔

بیگم: مَیں نے جو کچھ کیا، اپنے خاندان کی خاطر کیا۔ یہ ہم برداشت نہیں کر سکتے کہ ایک طوائف اس خاندان کی بہو بنے۔

شیدا: آپ نے خواہ مخواہ اتنی تکلیف کی۔ کون طوائف ایسے خاندان کی بہو بننا پسند کرے گی، جس کی عورتیں نوجوان لڑکوں کو گھر میں بُلا کر ساز باز کرتی ہیں۔ جہاں مقصد کی خاطر رشوت کا سہارا لیا جاتا ہے۔ جہاں جھوٹے نام کی خاطر مائیں اپنے بچوّں کی خوشی قربان کر دیتی ہیں۔

بیگم: بکواس بند کرو۔ مَیں ایک لفظ اور نہیں سُننا چاہتی۔ نکل جاؤ میرے گھر سے۔

شیدا: اس گھر میں رہنا میرے لئے کون سا فخر کا باعث ہے۔ مَیں ایسے گھر میں رہنا اپنی توہین سمجھتا ہُوں، جس کی دیواریں جھوٹ فریب اور رشوت پر تعمیر کی گئی ہوں۔

(غصّے سے باہر نکل جاتا ہے۔ اُس کے پیچھے رُسوا اور پھر منشی۔ انور بھی اُن کے پیچھے جانے لگتا ہے۔ لیکن منشی اُسے دھکّا مار کر پیچھے گرا دیتا ہے)

چھٹا منظر

(اُمراؤ جان اور بی خانم اپنے کوٹھے پر
بیٹھی ہیں کہ مرزا رُسوا اور رشید داخل
ہوتے ہیں)

رُسوا: لیجئے اُمراؤ جان، سنبھالئے اپنے رشید صاحب کو۔

ادا: تسلیم عرض کرتی ہوں رشید صاحب۔ زہے نصیب کہ آپ ہمارے کوٹھے تک تشریف لائے۔ فرمائیے بندی کیا خدمت کر سکتی ہے۔

(پان کی طشتری آگے بڑھاتی ہے)

پان پیش کروں۔

(طشتری پیچھے ہٹا کر)

نہیں۔ آپ ان انگلیوں سے چھوا ہُوا پان کیسے قبول کر سکتے ہیں، جو کسی کے اشاروں پر کھلتی اور بند ہوتی ہیں۔

شیدا: میری بات بھی نہیں سنو گی؟

ادا: یہ کوٹھے کے اصول کے خلاف ہے۔ یہاں لوگ اپنی سُنانے نہیں آتے، ہماری سُننے آتے ہیں۔

شیدا: لیکن میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہُوں۔

ادا: کیا فرق ہے اُن لوگوں میں اور آپ میں۔

شیدا: مَیں تمھیں دل وجان سے محبّت کرتا ہُوں اُمراؤجان۔

ادا: یہ جملہ اِس کوٹھے پر آنے والے ہر تماش بین سے سُن چکی ہُوں۔

شیدا: مَیں جانتا ہُوں تمھیں طنز کے نشتر چبھونے کا حق ہے۔ لیکن ----

ادا: ہم کون ہوتے ہیں نشتر چبھونے والے۔ اور پھر آپ جیسے کرم فرماؤں کو جن کے کرم پر ہماری زندگی کٹ رہی ہے؟ آپ ناراض ہو گئے تو ہماری روزی روٹی کا کیا ہو گا؟

شیدا: خدارا اس طرح کی باتیں نہ کرو امراؤ۔ مَیں ----- مَیں تم سے بے پناہ محبّت کرتا ہوں۔ اور تم سے ---- تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی

اسی وقت۔

ادا: نہیں نہیں شیدا صاحب، اتنی اونچی آواز میں اس طرح کی باتیں مت کیجئے۔ اگر آپ کی امّی جان نے سُن لیا تو بہت ناراض ہوں گی۔

شیدا: تم سمجھتی کیوں نہیں۔ وہ جو غلط فہمی پیدا ہوئی تھی میرے دل میں، ایک لمحے کے لئے۔ وہ دُور ہو گئی ہے۔ وہ جو کچھ دیر کے لئے میرے دل پر وہم و گمان کے بادل چھا گئے تھے، اب چھٹ چکے ہیں۔ مجھے معاف نہیں کرو گی؟

ادا: کیا کہہ رہے ہیں شیدا صاحب؟ ایک طوائف سے معافی مانگتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آرہی۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو آپ کی خاندانی شرافت کو داغ نہیں لگ جائے گا؟

شیدا: (چلاّ کر)

بس کرو خدارا، بس کرو اُمراؤ۔ اسی چھوٹی سی بات کو لے کر یوں دو زندگیاں تباہ نہ کرو۔ مجھے پتہ چل چکا ہے کہ انور کو یہاں کس نے بھیجا تھا۔ اُس نے مجرے کی فرمائش کیوں کی۔ تم نے اُسے مجُرا کیوں سنایا۔ میرا دل اب تمھاری طرف سے بالکل صاف ہے۔ مجھے اب تم سے کوئی شکایت نہیں۔

ادا: آپ سمجھتے ہیں یہ بہت بڑی بات ہے کہ آپ کا دل صاف ہو گیا۔ میرے دل کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے کیا؟ آپ کے دل میں محبّت کی آگ بھڑکے تو

اُسے میرے دل میں بھی بھڑکنا چاہیئے۔ آپ کے دل میں یہ بھڑکا ہوا شعلہ راکھ ہو جائے۔ تو کیا مجھے بھی یہ شعلہ بجھانا ضروری ہو جاتا ہے۔ مَیں "موم کی گڑیا" نہیں ہوں شیدا صاحب کہ آپ جب چاہیں، مجھے توڑ مروڑ سکتے ہیں۔ مَیں ایک عورت ہوں، جس کے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل ہے۔ اس دل نے کسی کے اشاروں پر دھڑکنا نہیں سیکھا۔ اس کی دھڑکن کسی کی مرہونِ منّت نہیں۔

شیدا: اُمراؤ، میں آپ سے محبّت کرتا ہوں۔

ادا: خدا کے لئے محبّت جیسے پاک لفظ کو ذلیل مت کیجئے۔ آپ کیا جانیں محبّت کیا ہوتی ہے۔ محبّت کرنے والے جہاں اپنے محبوب کو چلتا دیکھتے ہیں۔ وہ جگہ اُن کے لئے متبرک ہو جاتی ہے۔ وہاں اُن کا سر خود بخود سجدے کے لئے جُھک جاتا ہے۔ محبّت ایک اعتبار، ایک بھروسے کا نام ہے شیدا صاحب۔ جوش و خروش سے کئے گئے دعوؤں کا نام نہیں۔

شیدا: جو رشتہ ہمارا آپ کے ساتھ تھا۔ اُسے آپ کیا نام دیں گے۔

ادا: وہ ..... وہ تو شاید میرے اشعار کی داد تھی، یا میرے .... میرے حُسن کی تعریف تھی۔ وہ تعریف جو کوئی لڑکی دیکھ کر کسی بھی من چلے کے مُنہ سے نکل جاتی ہے۔

شیدا: خدا کے لئے یوں نہ کہو اُمراؤ۔ ضد میں آ کر مجھے ٹھکراؤ نہیں۔

میں زندگی میں تمھیں وہ مقام دینا چاہتا ہوں، جس پر تمھارا حق ہے۔

ادا: شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لیکن بی خانم جو میری ماں ہیں۔ اُن کو آپ ساس کا درجہ دے سکیں گے۔

شیدا: تمھاری سگی ماں ـــــ

ادا: میری سگی ماں بی خانم ہیں اور کوئی نہیں۔

شیدا: یہ تمھارا آخری فیصلہ ہے امیرن۔

ادا: یہاں کوئی امیرن نہیں رہتی۔ یہ اُمراؤ جان اداؔ کا کوٹھا ہے، جو ایک طوائف ہے۔ ساز چھیڑیئے استاد جی شائقین کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔

(سازندے ساز چھیڑتے ہیں اور امراؤ جان
غزل سرائی شروع کرتی ہے)

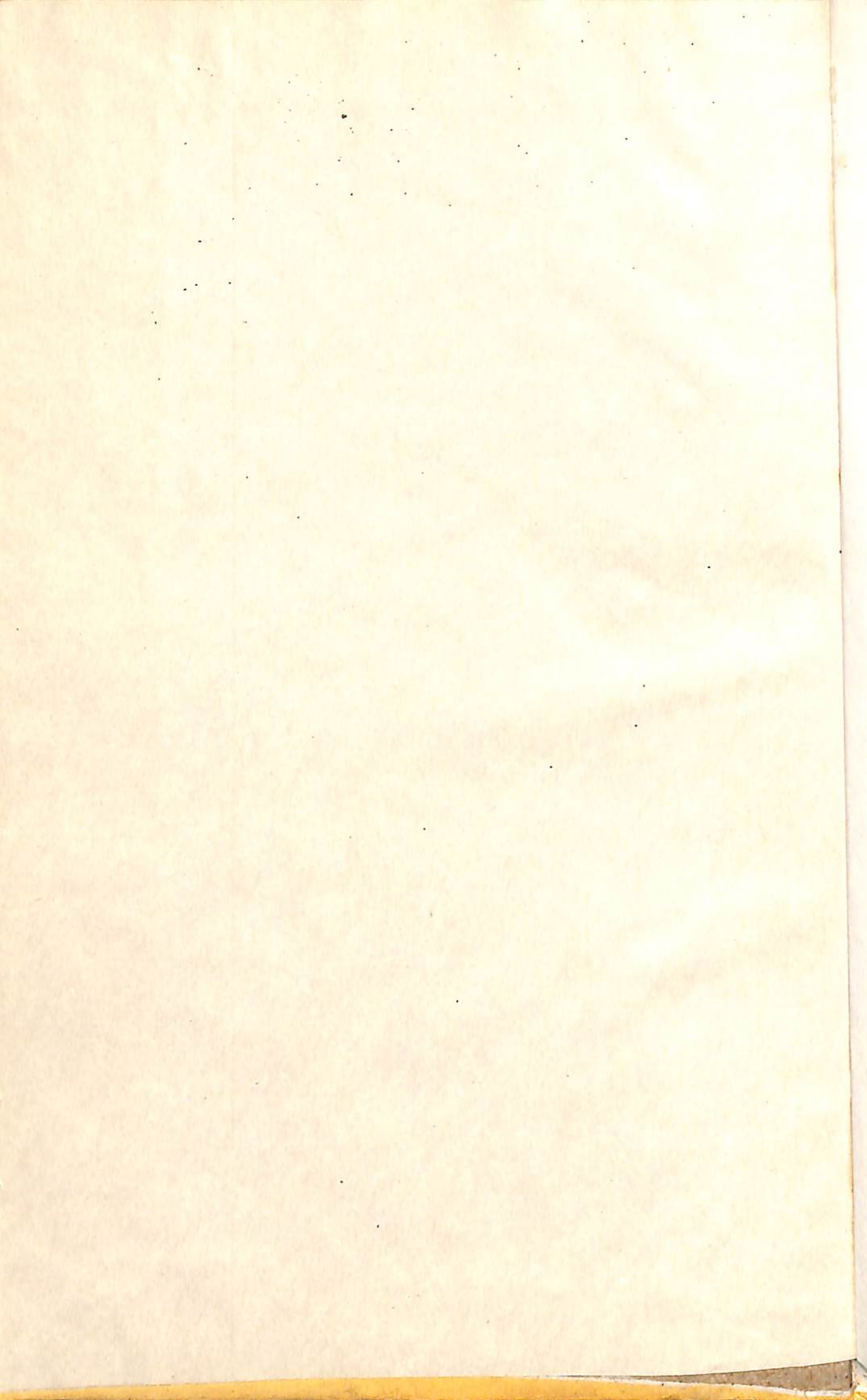
مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی
اسی کافر کی ادا یاد آئی

تم کو اُلفت نہ وفا یاد آئی
یاد آئی تو جفا یاد آئی

تم جدائی میں بہت یاد آئے
موت تم سے بھی سوا یاد آئی

چارہ گر زہر منگا دے تھوڑا
لے مجھے اپنی دوا یاد آئی

(پردہ)





دلیپ سنگھ کا جنم ۱۹۳۲ء میں ضلع گوجرانوالہ (پاکستان) میں ہوا۔ ملک کی تقسیم کے بعد وہ دلّی میں بس گئے۔

دلیپ سنگھ طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں ایک جانا پہچانا نام ہے۔ اُن کے مضامین کے دو مجموعے "سارے جہاں کا درد" اور "گونجتے ہیں قفس کے" شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈرامے کی صنف میں بھی اُن کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لئے متعدد ڈرامے لکھ چکے ہیں۔ اُن کے ٹی وی سیریلز "تصویر کا دوسرا رُخ"، "دل دریا"، "یہ دُنیا غضب کی" اور "دوسرا کیول" بہت پسند کئے گئے ہیں۔ حال ہی میں اُن کا ناول "دل دریا" شائع ہُوا ہے۔

"موم کی گڑیا" کئی بار سٹیج ہو چکا ہے اور دُوردرشن اور ریڈیو سے نشر ہو چکا ہے۔